ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

دسمبر ۲۰۲۲ء

आज़ादी का अमृत महोत्सव

G20

محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

उत्तर प्रदेश

۱۵ روپے

وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ سابق گورنر اتر پردیش جناب رام نائک کو تحفہ پیش کرتے ہوئے۔

وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ اور پرنسپل سکریٹری جناب سنجے پرساد و دیگر افسران کے ساتھ ایک تقریب میں شرکت کیلئے جاتے ہوئے۔

جلد:77 شمارہ:08

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

دسمبر ۲۰۲۲ء

سرپرست
جناب سنجے پرساد
پرنسپل سکریٹری محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اترپردیش

پبلشر: ششر (ڈائرکٹر، انفارمیشن)

جناب انشمان ترپاٹھی (ایڈیشنل ڈائرکٹر، انفارمیشن)

اداراتی مشیر
محترمہ کُمکُم شرما (ڈپٹی ڈائرکٹر، انفارمیشن)

ایڈیٹر
ریحان عباس
رابطہ:9838931772
Email:nayadaurmonthly@gmail.com

معاون: شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرسالانہ:
صباعرفی:7705800953
آسیہ خاتون

تزئین کار: ایم۔ ایچ۔ ندوی
مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ
شائع کردہ: محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اترپردیش
زرسالانہ: ۱۸۰/روپے
ترسیل زر کا پتہ
ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پنڈت دین دیال اُپادھیائے سوچنا پریسر، پارک روڈ، اترپردیش، لکھنؤ226001

Pleas send Cheque/Bank Draft in favour of Director,Information & Public Relations Department,Pandit Deendayal Upadhyay Soochna Parisar,UP,Lucknow

خط وکتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱
بذریعہ کوریئر/رجسٹرڈ پوسٹ
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پارک روڈ، سوچنا بھون، اترپردیش، لکھنؤ226001

ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

اس شمارے میں...

اداریہ

اپنی بات ۲

مضامین

لکھنؤ میں اردو صحافت: تحقیق کے چند زاویے	پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی	۳
حیات اللہ انصاری کی صحافتی خدمات	ڈاکٹر انوار ادیب	۶
بچوں کا ادب اور فاطمہ وصیہ جائسی	پروفیسر عابد حسین حیدری	۸
اطفال ادب کے معمار: متین طارق	ڈاکٹر رضوان انصاری	۱۱
ف۔س۔اعجاز اپنا جواب آپ	کوثر صدیقی	۱۵
اسرار احمد حیات وخدمات" ڈاکٹر محمد اطہر مسعود کا لائق ستائش کارنامہ	منظور پروانہ	۱۷

منظومات

غزلیں	ڈاکٹر محمد شفیع سیتاپوری/مجاز مرزا، لکھنوی	۲۰
غزلیں	کلیم سہسرامی/شاذیہ نیازی	۲۱
غزلیں	ڈاکٹر طالب اکرام/خوشبو پروین	۲۲
غزل	شاذیہ خان	۲۵

افسانے

نابینا سرکار	حبیب کیفی	۲۳
پارٹ ٹائم شوہر	ڈاکٹر کہکشاں عرفان	۲۶
دادی کی زبانی	حسن بانو	۲۹

افسانچہ

دل ودماغ کا وہم	رضوان عباس	۳۱

ترقیات

نئے ہندوستان کا نیا اور ترقی یافتہ اترپردیش	ہشام غزالی	۳۲

ماہنامہ نیا دور، information.up.nic.in ویب سائٹ پر دستیاب ہے۔
قیمت فی شمارہ: پندرہ روپے — سالانہ رکنیت فیس: ایک سو اسی روپے
دو سال کی رکنیت فیس: تین سو ساٹھ روپے
تین سال کی رکنیت فیس: پانچ سو چالیس روپے
نوٹ: اپنی کمپوز شدہ تخلیقات، مندرج ای: میل آئی ڈی پر ہی ارسال کریں۔

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اترپردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

ماہنامہ نیا دور دسمبر ۲۰۲۲ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

اردو زبان وادب کی موجودہ صورت حال اپنے عصری توقع کے منافی ہے۔ ایسے ماحول میں رسائل وجرائد کا شائع ہونا کسی نعمت سے کم نہیں، خاص کر سرکاری مراعات کے دست نگر نکلنے والے رسالے۔ غیر سرکاری اداروں سے نکلنے والے جرائد بھی بڑی کسمپرسی کے شکار ہیں۔ اگر کوئی خود کفیل شخص اردو کی محبت میں اس میدان میں شہسواری کی کوشش بھی کرتا ہے، تو کچھ لوگوں کا رویہ اتنا منفی ہوتا ہے، کہ اس کی دل آزاری کے ساتھ حوصلہ شکنی ہونا طے ہے۔ موجودہ دور میں کچھ غیر سرکاری رسالے ضرور ہیں جو ان تمام دشواریوں کے باجود اپنے بھرپور استقامت کے ساتھ شائع ہورہے ہیں، حالانکہ وہ رسالے آج بھی اپنے قارئین کے فقدان کی نوحہ گری کے شکار ہیں، چونکہ اردو معاشرے میں کتب بینی کا شوق دھیرے دھیرے ختم ہوتا جارہا ہے۔ معاملہ یہاں تک آن پہنچا ہے کہ اردو کے جو بچے کھچے قارئین رہ بھی گئے ہیں، وہ بھی بغیر معاوضہ کے رسائل وجرائد کے خواستگار ہیں۔ ایسی حالت میں اپنی جیب خاص سے کسی رسالے کی اشاعت کرنا ایک امر محال کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ یہی کچھ حال سرکاری رسالوں کا بھی ہے۔ اس میں وہی لوگ چھپنے اور چھپانے کے خواہشمند ہوتے ہیں جنھیں اپنے پی ایچ ڈی ایوارڈ کرانے کے لئے یا لکچرر یا پروفیسر شپ کے لئے مضمون چھپوانا لازمی ہوتا ہے۔ خیر

اطلاعاًیہ بات عرض کرنا ضروری ہے کہ اب ماہنامہ نیا دور کا ۷۵ برس کے مکمل ہونے پر جس ”پلیٹنم جوبلی خصوصی نمبر“ کی اشاعت کا اعلان کیا گیا تھا وہ اب بہت جلد مکمل ہونے جارہا ہے ادھر کئی ماہ سے شماروں کی اشاعت تو ہو رہی ہے لیکن لوگوں تک رسالہ پہنچ نہیں رہا تھا، جس کی شکایت مسلسل موصول ہو رہی تھی، ان دفتری پیچیدگیوں کا کافی حد تک ازالہ کیا جا چکا ہے۔ بہت جلد اپنی سابقہ پابندیوں کے ساتھ ماہنامہ نیا دور لوگوں کو ارسال کیا جائے گا۔

ماہنامہ نیا دور کا یہ شمارہ صحافت اور اس سے متعلق چند زاویے پر منحصر شمارہ ہے۔ پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی کا پیش کردہ مضمون ”لکھنؤ میں اردو صحافت: تحقیق کے چند زاویے“ کے ذریعہ اردو صحافت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر انور ادیب کا ”حیات اللہ انصاری کی صحافتی خدمات (قومی آواز کے تناظر میں) شامل کیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو صحافت کب سے شروع ہوئی، اور کہاں سے اس کا آغاز ہوا، کیسے پروان چڑھی، اس بارے میں اگر آپ تحقیق کریں گے تو یہ واضح ہوگا کہ صحافت کی یافت و بازیافت میں بھی ماہنامہ نیا دور کا ایک اہم کارنامہ ہے، کیونکہ سب سے پہلے اردو صحافت پر ۲۰۱۱ء میں صحافت نمبر نکلا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ صحافت پر نیا دور نے پہل کی۔ ویسے تو صحافت کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے تو پتہ چلتا ہے کہ مولانا ابو الکلام آزاد کا ’الہلال والبلاغ محمد علی کا ’ہمدرد‘، مولانا ظفر علی خاں کا ’زمیندار‘، حسرت موہانی کا ’اردو معلی‘، مہاشے کرشن کا ’پرتاپ‘ سردار دیوان سنگھ کا ’ریاست‘، مولانا عبد الماجد دریا آبادی کا ’صدق‘ وغیرہ ان سب نے اردو صحافت کی زبردست تاریخ مرتب کی اور اردو صحافت کو جلا بخشی۔

اس کے علاوہ پروفیسر عابد حسین حیدری کا ’بچوں کا ادب اور فاطمہ وصیہ جائسی‘، ڈاکٹر رضوان انصاری کا مضمون ’اطفالِ ادب کے معمار: متین طارق‘ کوثر صدیقی کا ’ف۔س۔ اعجاز اپنا جواب آپ‘ اور منظور پروانہ کا ’اسرار احمد حیات وخدمات“ ڈاکٹر محمد اطہر مسعود کا تجزیاتی مضمون بھی شامل کیا گیا ہے، امید ہے کہ قارئین اس کو ضرور پسند فرمائیں گے۔

ریحان عباس

یہ شمارہ دسمبر ۲۰۲۲ء کا ہے جس کو مارچ ۲۰۲۴ء میں شائع کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی
شعبۂ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ
9319742882

لکھنؤ میں اردو صحافت: تحقیق کے چند زاویے

موجودہ تحقیق ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ کے روز اردو صحافت کا آفتاب مشرقی ہندوستان سے طلوع ہوا۔ مسکن اس کا کلکتہ اور نام اس کا جام جہاں نما تھا۔ صحافت کے بازار پر فارسی کا دبدبہ تھا، جام جہاں نما اردو کے چند شماروں کے بعد فارسی کی طرف مراجعت کر گیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اردو صحافت پر تو نکال رہی تھی لیکن اڑان بھرنے کی فضا ہموار نہیں تھی۔ برطانوی حکومت نے جب فارسی کو سرکاری زبان کے منصب سے سبکدوش کیا تو اردو زبان کے لئے آسمان کشادہ ہوا۔ یہ سب تاریخی حقیقتیں ہیں جن سے اردو زبان و ادب اور خصوصاً نثر کی ترقیاں وابستہ ہیں۔

اردو زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ملی لیکن اس کا پیش خیمہ پہلے سے تیار ہو رہا تھا جس میں فورٹ ولیم کالج کا اہم کردار ہے۔ اردو زبان کی تاریخ پر نظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ فارسی کا زوال اور اردو زبان کا فروغ سرکار کے ہاتھ پکڑنے اور ہاتھ کھینچنے کی کہانی ہے۔ اب اس تاریخی حقیقت کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا جائے کہ زبانیں حکومت کے دستِ کرم کی مرہونِ منت ہوتی ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ اردو زبان کے فروغ اور زوال کے حالیہ منظر نامے کو مذکورہ منطق کی روشنی میں دیکھا جائے تو اردو زبان کی موجودہ صورت آئینہ ہو جاتی ہے اور اسباب و علل کی تلاش میں ذہن متحرک نہیں ہوتا۔

یہ حقیقت ہے کہ اردو صحافت کے تاریخ نگاروں نے لکھنؤ کی اردو صحافت کو نظر انداز نہیں کیا ہے لیکن اس موضوع پر ایسا کام بھی نظر نہیں آتا جس پر اطمینان کا برملا اظہار کیا جا سکے۔ لکھنؤ کی صحافت پر چند صفحات پر مشتمل ابواب بعض کتابوں میں مل جاتے ہیں۔ چند ادیبوں اور صحافیوں نے بھی لکھنؤ کی صحافت پر قلم اٹھایا ہے اور مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں کے برابر نہیں ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے اودھ کی صحافت کے آغاز و ارتقا پر پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ بھی لکھا گیا ہے۔ لکھنؤ کی صحافت کے متعلق یہ علمی مواد میری نظر میں شبنم سے پیاس بجھانے کے مترادف ہے۔

پروفیسر محمد حسن نے لکھنؤ کی صحافت پر سب سے پہلے کام کرنے کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اپنا مضمون 'لکھنؤ میں اردو صحافت' کو یادداشت کی بنیاد پر لکھا ہے۔ یہ مضمون خالد محمود اور سرور الہدیٰ کی مرتب کردہ کتاب 'اردو صحافت۔ ماضی اور حال' میں شامل ہے۔ اس مضمون کو لکھنے کے دوران شر رکا دلگداز انھیں اس کے مناسب مقام پر یاد نہیں رہا بعد میں انھوں نے اس کمی کا ازالہ کیا۔ یہیں پر ان کو احساس ہوا کہ اخبارات کی فہرست ہونا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ان گنت اخبارات و رسائل فہرست میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں... جو کچھ لکھا گیا ہے محض یادداشت کے سہارے پر اور یہ سہارا خاصا ناقابل اعتبار ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ لکھنؤ سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی ایک جامع و واضح فہرست تیار کی جائے۔

(اردو صحافت۔ ماضی اور حال، ص ۴۸)

امجد حسین صاحب کے زمانے میں 'نیا دور' نے بھی ایک کوشش کی تھی 'اودھ آئینۂ ایام میں' اس اودھ نمبر میں پروانہ ردولوی اور حسن واصف عثمانی صاحبان کے مضامین نظر آتے ہیں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر رہا ہوں کہ لکھنؤ کی صحافت پر کل اتنا ہی مواد مہیا ہے لیکن بادی النظر اور معمولی تلاش کے نتیجے میں یہی اوراق ہاتھ آتے ہیں۔ میری نظر سے اب تک اس موضوع پر کوئی مسلسل کتاب نہیں گزری اور نہ کسی محقق کی کتاب کے کتابیات میں کوئی ایسی کتاب نظر آئی جو لکھنوی صحافت کا احاطہ کرتی ہو۔ اور ابھی جس مقالے کا ذکر کیا ہے وہ بھی اس کمی کو پورا نہیں کرتا۔

"ایک تو ریختہ کی کوششوں سے کافی مواد اب آن لائن آ گیا ہے، یہ سہولت عثمانی صاحب تک مہیا نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر عبدالرزاق فاروقی صاحب نے منشی سجاد حسین اور اودھ پنچ پر تحقیق کر کے تحقیق کا عملی نمونہ پیش کیا ہے۔ منشی نول کشور پر تو کئی تحقیقی کام ہوئے ہیں۔ ابھی چند سال قبل ہمانشو باجپئی نے اچھا تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ یہ وہی ہمانشو باجپئی ہیں جنہوں نے پہلے صحافت اور اب داستان گوئی کی دنیا میں نام پیدا کیا ہے۔ تیسرے مولوی قمر الدین خان کے اسعد الاخبار کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے، یہ اخبار ۱۸۴۷ میں ۵۲ کاپیوں سے شروع ہوا اور چند برسوں میں ۱۲۰ کاپیوں تک پہنچا اور پھر گھٹتے گھٹتے ۴۶ کاپیوں پر آ گیا۔ اس اخبار کی اپنی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ اخبار کی اتنی کم کاپیوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ واقعی اس کی کاپیاں ناپید ہوں گی لیکن یہ حقیقت نہیں ہے ۱۸۵۴ کی سرکاری پریس رپورٹ میں اس کی چار سال کی جلدوں کا تجزیاتی مطالعہ موجود ہے۔"

نیادور کی ایک اور کوشش کا بھی ذکر کر دینا یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ۲۰۱۱ء میں نیا دور نے صحافت نمبر نکالا۔ اس میں لکھنؤ کی صحافت پر کوئی خصوصی مضمون نہیں ہے، اتر پردیش اور اودھ کی صحافت پر دو مضامین ہیں۔

نیادور کے اودھ اور صحافت نمبروں میں خاطر خواہ مواد نہیں ہے، اس موضوع پر کوئی کتاب موجود نہیں، کچھ کتابوں میں جستہ جستہ مواد ہے اور گنتی کے مضمون ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ لکھنؤ کی صحافت کے متعلق مواد وجود سے عدم میں رخصت ہو گیا ہو؟ اس سوال کا ذہنوں میں اٹھنا کوئی غیر مناسب بات نہیں ہے۔ معروف صحافی حسن واصف عثمانی بھی اس معاملے میں تذبذب کا شکار ہیں وہ لکھنؤ کی صحافت کو تحقیق کا موضوع بھی مانتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ تحقیق کامل ہو نہیں سکتی۔ دیکھئے وہ کیا کہتے ہیں:

> لکھنؤ میں اردو صحافت کی تاریخ اتنی وسیع ہے کہ اس کا احاطہ تحقیق اور خالص تحقیق بن جاتا ہے۔ ۱۹ویں اور ۲۰ویں صدی میں لکھنؤ سے بے شمار رسالے، اخبار، اور ماہنامے نکلے ان کے ناموں کی پوری فہرست مرتب کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ بڑے بڑے اہم اخباروں کے فائلوں ناپید ہیں۔ قدیم اخباروں کے متفرق شمارے کہیں کہیں مل جاتے ہیں مگر اودھ اخبار، اودھ پنچ اور روزنامہ ہمدم کے مکمل فائل دستیاب نہیں ہوتے۔ لکھنؤ کی صحافت کی تاریخ لکھنے یا اس سلسلے میں تحقیق اسی لئے ناممکن اور محال نہ بھی ہو ادھوری اور نامکمل ضرور رہے گی۔

(نیادور اودھ نمبر، اودھ آئینۂ ایام میں ص ۲۳۷)

عثمانی صاحب کے قول کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ جزوی طور پر تو سچائی رکھتا ہے لیکن مکمل صداقت کا احاطہ نہیں کرتا۔ ایک تو ریختہ کی کوششوں سے کافی مواد اب آن لائن آ گیا ہے، یہ سہولت عثمانی صاحب تک مہیا نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر عبدالرزاق فاروقی صاحب نے منشی سجاد حسین اور اودھ پنچ پر تحقیق کر کے تحقیق کا عملی نمونہ پیش کیا ہے۔ منشی نول کشور پر تو کئی تحقیقی کام ہوئے ہیں۔ ابھی چند سال قبل ہمانشو باجپئی نے اچھا تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ یہ وہی ہمانشو باجپئی ہیں جنہوں نے پہلے صحافت اور اب داستان گوئی کی دنیا میں نام پیدا کیا ہے۔ تیسرے مولوی قمر الدین خان کے اسعد الاخبار کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے، یہ اخبار ۱۸۴۷ میں ۵۲ کاپیوں سے شروع ہوا اور چند برسوں میں ۱۲۰ کاپیوں تک پہنچا اور پھر گھٹتے گھٹتے ۴۶ کاپیوں پر آ گیا۔ اس اخبار کی اپنی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ اخبار کی اتنی کم کاپیوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ واقعی اس کی کاپیاں ناپید ہوں گی لیکن یہ حقیقت نہیں ہے ۱۸۵۴ کی سرکاری پریس رپورٹ میں اس کی چار سال کی جلدوں کا تجزیاتی مطالعہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ عتیق صدیقی صاحب نے بھی اس کی جلدیں دیکھی ہیں جس کا ذکر انھوں نے اپنے مضمون اسعد الاخبار میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> راقم الحروف کو اسعد الاخبار کا ایک مجموعہ (اوائل مئی ۱۸۴۷ تا اواخر فروری ۱۸۵۲) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جس کی حسب ذیل خصوصیت قابل ذکر ہیں۔

(ہندوستانی صحافت، محمد عتیق صدیق کے صحافتی مضامین، مرتب و ناشر محمد ارشد، سنہ اشاعت ۲۰۱۱، ص ۱۵۱)

عتیق صاحب نے آگے اسعد الاخبار کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ عتیق صاحب کا یہ صحافتی مضمون خاصا طویل اور تحقیقی معلومات سے مالا مال ہے۔ میں یہ باتیں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ لکھنؤ کی صحافت پر کام کرنے والوں کا حوصلہ مزید بڑھ جائے۔ میں نے ابھی ڈاکٹر عبدالرزاق فاروقی صاحب کی تحقیق کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے دکن سے لکھنؤ آ کر تحقیق کا کام مکمل کیا ہے۔ ان کی کتاب 'اودھ پنچ کی ادبی خدمات' مطبوعہ ۱۹۸۲ کو پڑھیے، آپ کو بڑے مزے کی باتیں معلوم ہوں گی اور ان سے مزید تحقیق کی راہیں کھلیں گی۔ دو ایک باتوں کا یہاں ذکر کرتا ہوں، کاکوری میں رات میں جب کوئی داماد سسرال جاتا ہے تو خادم لالٹین لے کر آگے آگے چلتا ہے۔ اب تو شاید یہ روایت نہ ہو لیکن زمینداری کے زمانے میں یہ روایت تھی۔ منشی سجاد حسین نے اس روایت کا مذاق بہت اچھے انداز سے اڑایا۔ پالتو کتے کے منہ میں لمبی ڈنڈی رکھی اور ڈنڈی اور توازن کو ملحوظ رکھتے ہوئے دو لالٹینیں ٹانگی اور سسرال کی طرف چل دئے۔ ذرا! اس منظر کو نگاہوں میں بھریے اور طنز و مزاح کے صحافی کی عملی صحافت بھی ملاحظہ فرمائیے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سجاد صاحب کو اپنی خدمت کے لئے نوکروں کا رکھنا بھلا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان کی ضرورت کو جانوروں سے پورا کرا لیتے تھے۔ ایک قصہ تو آپ نے سن لیا۔ ایک اور سن لیجئے۔ انھوں نے مہمانوں کے استقبال اور آمد کی خبر کے لئے قازیں پالی تھیں۔ جب کوئی آتا تو وہ دروازے پر پہنچتی اور چیخ پکار شروع کر دیتی اور منشی صاحب مہمان کے استقبال کے لئے دروازے پر برآمد ہو جاتے تھے۔ ان واقعات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ منشی سجاد حسین صرف دنیائے قرطاس و قلم ہی کے نہیں، زندگی کے ہر پہلو میں طنز و مزاح سے کام لیتے تھے۔ اگر کوئی طالب علم نفسیات کی گتھیاں سلجھانے میں دلچسپی رکھتا ہے تو سجاد حسین کی زندگی کے اس کے تحقیقی مزاج کے لئے کتنی پرکشش ہو جائے گی۔ اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

میں آپ سے کہوں کہ منشی سجاد حسین کو ان کے والد منظور حسین صاحب نے عاق کر دیا تھا تو آپ یقین کریں گے؟ سونے پر سہاگا اس میں اتنا اضافہ اور کر دوں کہ اس عاق کا ایک سبب کسی کی بیوی کو اغوا کرنا تھا۔ تو کیا یہ باتیں حیرت پیدا نہیں کریں گی؟ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں بالکل کریں گی۔ اتنا اور بتاتا چلوں کہ ڈاکٹر عبدالرزاق فاروقی نے اس معاملے میں منشی صاحب کی بھرپور وکالت کی ہے اور ناسخ کی طرح جائداد میں حصہ ملنے کے ثبوت کا استعمال کیا ہے۔ لیکن جائداد میں حصہ ملنے سے بات بنتی نہیں ہے البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاق میں شدت نہیں وقتی پن تھا۔ نثار احمد خاں کی بیاض جس کی اساس پر بہت سی باتیں اپنی صداقت کے ساتھ سامنے آئی ہیں تو اسی بیاض موسومہ 'گلشن عباس' یہ بات کیسے غلط ہو سکتی ہے؟ میں اپنا فیصلہ نہیں سنا رہا ہوں بلکہ سوال اٹھا کر تحقیقی ذہنوں کو بیدار کرنے کی سعی کر رہا ہوں تا کہ عاق کا معاملہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔

میں نے اتنی باتیں عثمانی صاحب کی حوصلہ شکن خیال کے جواب میں کہی ہیں، میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ لکھنؤ کی صحافت میں اتنا مواد ضرور ہے کہ وہ جام جہاں نما کو چیلنج کر سکتا ہے۔ ٹیپو سلطان کے فوجی اخبار کو بنیاد بنا کر تحقیقی کاوشوں سے ہم واقف ہیں۔ ایک طالب علم نے ایک بزرگ کی بات کو جو بزرگ کے بھی دادا نے ان کو بتائی تھی اساس بنا کر فوجی اخبار کو اردو کا پہلا اخبار بنا دیا۔ یہ بات لاکھ گمراہ کن سہی لیکن اس سے تحقیق کے بہت سے باب وا ہوئے۔ میسور کی صحافت کی طرف اہل علم متوجہ ہوئے۔ منفی میں مثبت رنگ اور کثافت میں لطافت کی تعلیم ہمیں غالب دے گئے ہیں:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

نیادور کے اودھ نمبر میں پروفیسر جعفر رضا کا مضمون 'اودھ میں عزاداری' کے سلسلے میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے ایک اخبار کا ذکر کیا ہے جس میں عزاداری کے متعلق خبریں ملتی ہیں۔ یہ اخبار فوجی اخبار سے بھی دو سال قبل ۱۷۹۲ء کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''عزاداری سے متعلق متذکرہ بالا تفصیلات کی توثیق دربار آصفی کے منتخب خبر نامہ 'انتخاب اخبار نواب وزیر بہادر و انتخاب دربار معلی و اطراف' سے

ہوئی ہے، جس کی دو جلدیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی گریٹ برٹین اینڈ آیر لینڈ،لندن میں محفوظ ہیں۔‘‘

جعفر رضا صاحب نے اطہر عباس رضوی کی کتاب ’ہسٹری آف اثنا عشری شیعاز ان انڈیا‘ سے یہ معلومات حاصل کی ہیں۔ ’متذکرہ بالا تفصیلات‘ میں انھوں نے شاہانِ اودھ کا تذکرہ درگاہ حضرت عباس کی رونق بڑھانے کے تعلق سے کیا ہے۔ دورِ حاضر میں اودھ کی تاریخ کے دو تاریخ داں اس اخبار کو اردو زبان کا اخبار کہتے ہیں۔ اگر یہ بات تحقیقاً درست ہو جائے تو اردو صحافت کے آغاز کا سہرا اودھ اور لکھنؤ کے سر پر مزین ہو جائے۔ میں اس بات کا مدعی نہیں ہوں کہ اردو صحافت کا آغاز لکھنؤ سے ہوا، تاہم محققین کو اس طرف متوجہ کرانے کے لئے یہ بات عرض کر رہا ہوں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ مذکورہ اخبار فارسی زبان اور قلمی نوعیت کا ہوگا۔ چونکہ اودھ میں پریس کا وجود ۱۷۹۲ء تک نظر نہیں آتا۔ مذکورہ اخبار چاہے جس زبان میں ہو، لکھنؤ کی صحافت کی تاریخ کے زاویے سے ہر حال میں اہم ہے۔

لکھنؤ کی صحافت کی تاریخ کو فقط نوابین اودھ تک محدود نہیں کرنا چاہئے۔ فرنگی محل کا وجود نوابین کے دور سے کہیں پہلے کا ہے۔ فرنگی محل سے فارسی اور اردو زبان میں مذہبی، نیم مذہبی اور ادبی رسائل اجراء ہوئے ہیں۔ لکھنؤ کی اردو صحافت کا وہ اخبار جس کی کاپیاں موجود ہیں جس کو اولین اخبارات میں شمار کیا جاتا ہے، ’وہ طلسم لکھنؤ‘ ہے جس کو مولانا محمد یعقوب انصاری فرنگی محلی نے ۲۵ جولائی ۱۸۵۶ کو نکالا تھا۔ فرنگی محل کی اردو صحافت کی کڑیاں مولانا یعقوب سے لے کر حیات اللہ انصاری تک ملتی ہیں۔ لکھنؤ اور اردو صحافت کے فروغ میں فرنگی محل کی خدمات، اپنے آپ میں ایک ایسا موضوع ہے جس پر اب تک تحقیق کام ہو جانا چاہیے تھا۔

فرنگی محل کا ذکر ہو اور جوہری محلہ نظر انداز ہو جائے یہ ممکن نہیں۔ مولوی دلدار علی غفرانمآب جن کے خانوادے کو خاندان اجتہاد کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس خانوادے کی صحافتی خدمات بھی اب تک تحقیق کے دائرے میں نہیں آئی ہیں۔ دو درجن سے زیادہ مذہبی، نیم مذہبی اور ادبی رسائل عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں اس خاندان کے افراد نے نکالے ہیں۔ اس کے علاوہ شاگردان خاندان اجتہاد نے بھی بہت اخبارات و رسائل کی ادارت کی ہے۔ اخیار الاخبار تو خاندان عبقات کی یادگار ہے۔ محقق خاندان اجتہاد مولانا مصطفی حسین اسیف جائسی سے استفادے کے نتیجے میں مجھے معلوم ہوا کہ عہد سرسید میں خاندان اجتہاد کے ادباء ادبی اور مذہبی رسائل نکالتے تھے۔ غفران مآب کے پر پوتے ملاذ العلماء مولانا سید ابن حسن صاحب اصح الاخبار اور صاحب افادات مولانا مصطفیٰ حسین خورشید ’انتخاب‘ کے نام سے ادبی رسالہ نکالتے تھے جو اپنے زمانے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ خود بھی جائسی صاحب ’شعاع عمل‘ کے نام سے ادبی رسالہ نکال رہے ہیں جو فضل نقوی کے ہفت روزہ ’نظارہ‘ کے بعد کی کڑی ہے۔ معروف اردو صحافی شکیل حسن شمسی کے دادا اولاد حسین شاعر نے سب سے زیادہ ادبی رسائل نکالے ہیں۔ اب آپ انصاف سے بتائیے کہ کیا خاندان اجتہاد کی صحافتی خدمات تحقیقی مقالے کی متقاضی نہیں ہیں۔

اب میں آپ کا ذہن اردو کے ہندو صحافیوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ لکھنؤ کا پہلا اردو اخبار کس نے نکالا؟ موجودہ تحقیق کی روشنی میں اس کا جواب لال جی ہے۔ لال جی نے لکھنؤ اخبار کے نام سے اردو اخبار نکالا تھا۔ کسی بھی محقق کو اس کی کوئی کاپی دستیاب نہیں ہوئی ہے۔ نیشنل آرکائیو کے رجسٹر میں ۱۸۴۷ میں اس کا نام درج ہے اسی بنیاد پر یہ مان لیا گیا ہے کہ یہ ۱۸۴۷ میں نکلا تھا۔ اردو صحافت کی تاریخ میں نادر علی خاں نے ۱۸۵۷ تک لکھنؤ سے نکلنے والے سات اخباروں کا ذکر کیا ہے۔ ان اخباروں میں طلسم لکھنؤ کے علاوہ سحر سامری کی کاپیاں ہی ان کی نظر سے گزری ہیں۔ سحر سامری میں ۱۸۵۶ میں نکلنے والے نئے اخبارات کے اشتہارات کی اساس پر انھوں نے دیگر اخبارات کے نام گنا دئے ہیں۔ ظاہر ہے اس سے معلومات تو حاصل ہوئی ہے لیکن تحقیق کا حق ادا نہیں ہوا ہے۔ دوار یکا پرساد افق اپنے بھائی کے ساتھ مل کر منظوم اخبار نکالتے تھے۔ یہ منظوم اخبار بھی تلاش اور جستجو کا مستحق ہے۔ مولانا باقر شمس نے اس اخبار کا ایک ورق اپنی کتاب تاریخ لکھنؤ میں شائع کیا ہے۔ لکھنؤ کی اردو صحافت میں ہندو صحافیوں کی خدمات پر تحقیقی کام کیا جانا، کیا موزوں اور مناسب نہیں ہے؟

حسن واصف عثمانی صاحب کا مضمون ’لکھنؤ کے چند اخبار‘ اودھ نمبر میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے لکھنوی صحافت کی زبان کی انفرادیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ’لکھنؤ کی اردو صحافت نے کبھی اُس لسانی رویے سے انحراف نہیں کیا جو الفاظ، محاوروں اور جملوں کی ساخت میں کسی انحراف کو برداشت نہیں کرتا تھا، اس لئے لکھنؤ میں صحافت پر شعر و ادب کی گرفت برابر قائم رہی اور اخبار نویسی میں زبان و بیان کی ایک معیاری سطح کو برقرار رکھنے کی کوششیں بھی برابر ہوتی رہیں۔‘

(اودھ آئینہ ایام میں، ص ۲۳۸، پہلا ایڈیشن ۱۹۹۶)

عثمانی صاحب کی بات سے لکھنوی صحافت کے زبان پر تحقیقی زاویے سے کام کرنے کی احتیاج برآمد ہوتی ہے۔ عثمانی صاحب نے اپنے مضمون میں میر جان صاحب کے اخبار مسلم گزٹ کا ذکر کیا ہے جس کی ادارت مولانا وحید الدین سلیم نے کی تھی۔ مولانا وحید الدین صاحب کو وضع اصطلاحات سے ایک خاص لگاؤ تھا، ان کو وضع اصطلاحات کا امام کہا جائے تو بالکل درست ہوگا۔ مولانا کی اصطلاح سازی لکھنؤ سے بھی ایک اہم رشتہ رکھتی ہے، اس کا انکشاف مضمون کرتا ہے۔ عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

> وحید الدین سلیم اصطلاح سازی کے ماہر تھے بعد میں وہ پروفیسر وحید الدین کے روپ میں اردو میں اعلیٰ تعلیم کی پہلی یونیورسٹی جامعۂ عثمانیہ کے دارالترجمہ و تالیف کے ذریعے اصطلاح سازی کے بے مثال خدمات کی وجہ سے مشہور ہوئے لیکن ان کے کام کی ابتداء مسلم گزٹ سے پوری طرح وابستہ ہے۔

(اودھ آئینہ ایام میں، ص ۲۳۸)

اصلاح زبان اور اصطلاح سازی کے میدان میں لکھنوی صحافت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ جو چیزیں مشہور ہو جاتی ہیں وہی شناخت کے درجے میں شامل ہو جاتی ہیں۔ لکھنوی صحافت کا ذکر آتے ہی اودھ اخبار، اودھ پنچ، ہمدم، حق، حقیقت، دلگداز، نگار، مسلم گزٹ، معیار، سرفراز، نیا ادب، نیا دور وغیرہ اخبارات و رسائل کے ذہن میں آجاتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ کوئی فہرست نہیں ہے بلا مبالغہ کم سے کم سو اخبار ایسے ہوں گے جن کے نام ہم چاہ کر بھی نہیں گنا سکتے ہیں، کیوں کہ ہم ان سے باخبر ہی نہیں ہیں۔ پروفیسر محمد حسن نے مرزا رسوا کے ایک اخبار ’جن‘ کا ذکر کیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے تاریخ کی بوتل سے جن نکالا ہے۔

مذہبی، اصلاحی، سماجی، ادبی، لسانی اور سیاسی پہلوؤں سے دیکھا جائے تو لکھنؤ کے باوقار اخبار و رسائل کی تعداد کئی سو تک پہنچتی ہے۔ اخبارات و رسائل کی اتنی بڑی تعداد اور مذکورہ مختلف النوع زاویوں سے تحقیق کے فرائض کو انجام دینا کسی ایک آدمی یا کسی ایک ادارے کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لئے مشنری جذبے سے اجتماعی کوشش درکار ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے نفسیاتی تنقید کی تاریخ، اخبارات کی فائلوں سے گرد پوچھ پوچھ کر برآمد کی تھی۔ اگر صحافت پر کام کیا جائے تو فقط صحافت ہی کا نہیں بلکہ اردو ادب کی دیگر اصناف بھی اس سے مستفید ہوں گی۔

❑❑❑

ڈاکٹر انور ادیب

ابراہیم منزل، مسندی محلہ، ریلپور، پوسٹ ڈھڈکا، آسنسول

8597506577

حیات اللہ انصاری کی صحافتی خدمات

(قومی آواز کے تناظر میں)

اُردو صحافت کی تاریخ بیحد شاندار ہے۔ تاریخ کے اوراق الٹئے تو اس کا خوبصورت ماضی اپنی تمام تر تابناکیوں کے ساتھ نظروں میں گھوم جاتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا 'الہلال و البلاغ' محمد علی کا 'ہمدرد'، مولانا ظفرعلی خاں کا 'زمیندار'، حسرت موہانی کا 'اُردو معلی'، مہاشے کرشن کا 'پرتاپ'، سردار دیوان سنگھ کا 'ریاست'، مہاشے خوشحال چند کا 'ملاپ'، مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا 'صدق'، مولانا مودودی اور مولانا فارقلیط کے عہد میں 'الجمیعۃ' کافی مشہور ومقبول رہے ہیں۔ ان اخبارات نے اُردو صحافت کی زبردست تاریخ مرتب کی اور تحریک آزادی ہند میں عوام کی زبردست ذہن سازی کی۔ سیاسی مسائل سے عوام کے شعور کو بیدار کیا۔

انڈین نیشنل کانگریس جو ایک فعال اور قوم پرست سیاسی پارٹی تھی، نے اُردو اخبار کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا تاکہ عوام تک اپنے خیالات و افکار پہنچایا جاسکے۔ اُردو عوام کی بول چال کی اہم زبان تھی۔ اپنے خیالات کی ترسیل کے لئے اس کی اہمیت کو کانگریسی لیڈروں نے محسوس کیا چنانچہ پنڈت جواہر لعل نہرو کی سرپرستی میں ممتاز رہنما رفیع احمد قدوائی کے تعاون سے اُردو روزنامہ 'قومی آواز' کو 1944ء میں لکھنؤ میں جاری کیا گیا۔ ایڈیٹر کے لئے نظر انتخاب حیات اللہ انصاری (1999 - 1901) پر پڑی جو بیسویں صدی کے جید اُردو صحافتی اور ادیب تھے۔ انہوں نے ہفت روزہ 'ہندوستان' کے ذریعہ اُردو قارئین کو بے حد متاثر کیا تھا۔ انہیں عربی اور انگریزی زبانوں پر بھی قدرت حاصل تھی۔

انہوں نے 'قومی آواز' کے ذریعہ اُردو صحافت کو بلند معیار عطا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لئے انہوں نے اپنے عہد کی اُردو زبان کا گہرا مطالعہ کیا۔ اپنے مخلص رفقاء کے تعاون سے انہوں نے اُردو صحافت کے معیار کو بلند کرنے کے منصوبے پر عمل کیا۔

انہوں نے انداز و بیان کی طرف توجہ دی۔ اس وقت کے اخبارات کے طرز نگارش سے ہٹ کر اُسلوب اختیار کیا۔ خبروں کو من وعن پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس سے قاری کو مشن تک پہنچنے میں آسانی ہوگئی۔ انہوں نے عام فہم سادہ اُردو کے الفاظ کے استعمال کو ترجیح دی کہ اُردو صحافت کو بوجھل اور پیچیدہ جملوں سے دور رکھنے کی کوشش کی۔

اپنی بے باک صحافت سے اُردو صحافت میں ایک مثال قائم کردی۔ ان کا ادارتی نوٹ ان کی بے باکی کا آئینہ دار ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنی رائے دلائل کے ساتھ پیش کرتے تھے جس میں ان کی سیاسی بالغ نظری عیاں تھی۔ اس سے ان کے گہرے سماجی مشاہدے کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ بے حد تنقید سے احتراز کرتے تھے لیکن اپنی ذہانت دارانہ رائے کے اظہار میں پس وپیش نہیں کرتے تھے۔ اس میں ان کی کسی بڑی شخصیت کو وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ پنڈت نہرو سے اختلاف ہونے پر بھی اس کے اظہار میں جھجھکتے نہیں تھے۔ پروفیسر خلیق انجم جو انجمن ترقی اُردو کے جنرل سکریٹری تھے، نے ان کی بے باک صحافت کا اعتراف کیا ہے۔

(اُردو صحافت اور قومی آواز۔ خلیق انجم۔ 1986)

> ” جانے پہنچانے انگریزی الفاظ مثلاً کونسل ہاؤس، پارلیمنٹ، سیکریٹریٹ وغیرہ کا بلا تکلف استعمال کئے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ زبان کی ترقی کیلئے یہ ضروری ہے۔ اس سے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے اعتراض کو انہوں نے نظر انداز کردیا۔ انہوں نے ہندی سے لاتعداد الفاظ کا سلیقے سے استعمال کرکے اُردو کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔
>
> انہوں نے اُردو املا میں اصلاح کی بھی کوشش کی۔ کل ہند انجمن ترقی اُردو کانفرنس میں اُن اصلاحی اقدامات پر مدلل اظہارِ خیال کیا اور مضامین اور مقالے پڑھ کر انہیں منوایا بھی۔ ان کی اصلاحات کو انجمن نے بھی نہ صرف تسلیم کیا بلکہ ان کو برتنے کی سفارش بھی کی۔
>
> انہوں نے ہر نوعیت کی خبروں......سیاسی، علمی، ادبی...... کے لئے اخبار کے صفحات میں مناسب اور موزوں جگہیں مقرر کیں جس سے اخبار کی خوبصورتی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔“

قومی آواز کے اداریے کے پیشانی پر ایک شعر لکھنا ان کی جدت تھی جو بے حد مقبول ہوئی۔ یہ شعر ان کے اداریہ کی تفسیر بن جاتا تھا۔ اس سے ان کی تخلیقی صلاحیت اور ذوق ادب کا اندازہ ہوتا تھا۔

ممتاز صحافی گربچن چندن نے حیات اللہ انصاری صاحب کی اس جدت کو کافی سراہا اور اسے قارئین کے لئے تحفہ قرار دیا۔

(اُردو صحافت میں حیات اللہ انصاری کی پہل کاریاں)

انہوں نے جانے پہنچانے انگریزی الفاظ مثلاً کونسل ہاؤس، پارلیمنٹ، سیکریٹریٹ وغیرہ کا بلا تکلف استعمال کیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ زبان کی ترقی کیلئے یہ ضروری ہے۔ اس سے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے اعتراض کو انہوں نے نظرانداز کر دیا۔ انہوں نے ہندی سے لاتعداد الفاظ کا سلیقے سے استعمال کر کے اُردو کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔

انہوں نے اُردو املا میں اصلاح کی بھی کوشش کی۔ کل ہند انجمن ترقی اُردو کانفرنس میں اُن اصلاحی اقدامات پر مدلل اظہارِ خیال کیا اور مضامین اور مقالے پڑھ کر انہیں منوایا بھی۔ ان کی اصلاحات کو انجمن نے بھی نہ صرف تسلیم کیا بلکہ ان کو برتنے کی سفارش بھی کی۔ انہوں نے ہر نوعیت کی خبروں......سیاسی، علمی، ادبی......کے لئے اخبار کے صفحات میں مناسب اور موزوں جگہیں مقرر کیں جس سے اخبار کی خوبصورتی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے علاوہ علمی اور ادبی مباحث بھی شروع کئے گئے جس سے ادبی ذوق میں اضافہ ہوا اور صحافت کے ذریعہ ادب کی اہمیت بڑھنے لگی۔ فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، سید سجاد ظہیر وغیرہ جیسے قلمکار قومی آواز کے قلمی معاونین تھے۔ شعبۂ ادارت کے احسن کلیم، باقر رضوی، وجاہت علی سندیلوی، احمد جمال پاشا، عابد سہیل، قیصر تمکنت، عشرت علی صدیقی وغیرہ نے ادب وصحافت کی دنیا میں کافی شہرت ومقبولیت حاصل کی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قومی آواز نے علم وادب کی جمہوری فضا کو نکھارنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس سے عمدہ علمی نتائج بھی رونما ہوئے۔

قومی آواز کے مستقل کالموں کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ تراشے، ادبی ورق، شہر نامہ، کتابوں کی باتیں، فروگذاشت، فلم ریویوں، گلوریاں، دنیا کا حال اور بچوں کا گوشہ وغیرہ۔

تراشے کے تحت اُردو کے دوسرے اخبارات کے اہم ادارے نقل کئے جاتے تھے۔ افکار مضامین کے عنوان سے بھی دوسرے اخبارات کے مضامین نقل کئے جاتے تھے۔

'ادبی ورق' کے تحت ادبی محفلوں، ادبی تقاریب، مشاعروں وغیرہ پر مبنی رپورٹیں، تبصرے، روددادیں وغیرہ تفصیل کے ساتھ شائع کی جاتی تھیں۔

'شہر نامہ' میں شہری زندگی کے مسائل پر روشنی ڈالی جاتی تھی اور متعلقہ محکموں کو متوجہ کرانے کی کوشش کی جاتی تھی۔

'کتابوں کی باتیں' اُردو میں شائع کتابوں پر تبصرے شامل کئے جاتے تھے۔ جو علمی اور ادبی حلقوں میں بے حد مقبول تھے۔

'فروگذاشت' اس کالم کو مفتی رضا انصاری لکھا کرتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالحلیم 'دنیا کا حال' کالم لکھا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد اسے عشرت علی صدیقی لکھنے لگے۔ جسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔

'فلم ریویو' اس کالم کے تحت نئی فلموں پر تبصرے نئے انداز سے کئے جاتے تھے جسے بے حد پسند کیا جاتا رہا۔

'عالم اسلام' اس کالم کو مولانا محمود الحسن لکھا کرتے تھے۔ اسلامی حلقوں میں کالم بے حد مقبول تھا۔

'بزم خواتین' قومی آواز کی توجہ خواتین کی طرف مبذول کرانے کے لئے بزم خواتین کا قیام عمل میں آیا۔ جس میں ان کی بیوی سلطانہ حیات، ان کی ہم عصر رضیہ سجاد ظہیر اور دیگر خواتین اہل قلم سرگرم تھیں۔ اس طرح اس موقر جریدے میں خواتین کی اہمیت بڑھ گئی۔

'گلوریاں' یہ ایک فکاہی کالم تھا جسے شروع میں خود حیات اللہ انصاری لکھا کرتے تھے۔ بعد میں مجیب سہالوی، مشتاق پردیسی وغیرہ لکھتے رہے۔ یہ بھی ایک مقبول کالم تھا۔

حیات اللہ انصاری نے پہلی مرتبہ قومی آواز میں 'ادبی صحیفہ' کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے قبل اُردو روزناموں میں یہ رواج نہیں تھا۔

مراسلات ۔قارئین کے اظہار رائے کے لئے مراسلات کا کالم شروع کیا گیا۔ اور ان کے جوابات بھی شائع کئے جاتے تھے۔

بہتر طباعت ۔قومی آواز لیتھو پر چھپتا تھا کیونکہ وہ لیتھو پریس کا زمانہ تھا۔ حیات اللہ انصاری کی توجہ سے اسٹیلس اور پوسٹر قومی آواز میں خوب صورت انداز میں چھپتے تھے۔ ان کی کوششوں سے ہاف ٹون کی تصاویر قومی آواز میں چھپنے لگیں۔ ان کی اس کوششوں کو ملک بھر میں بے حد پسند کیا گیا۔ انہوں نے قومی آواز کو بین الاقوامی اخبارات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

اُردو صحافت کی تاریخ شاہد ہے کہ قومی آواز نے اپنے صحافتی اصول، معیارِ صحافت، جدید صحافتی زبان اور مستقل کالموں کے ذریعہ اُردو صحافت پر قابل قدر اثرات مرتب کئے جس کا بجا طور پر اعتراف کیا گیا۔

قومی آواز کی کچھ اور قابل قدر خدمات ملاحظہ فرمائیں۔

مسلمانوں میں سیکولرزم اور سوشلزم کے خیالات کو مدلل طریقے سے پھیلایا اور فرقہ پرست عناصر کو بے نقاب کیا۔ مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لعل نہرو کے سودیشی اور سوشلزم پر مبنی نظریات کو فروغ دیا۔ تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں میں پھیلی مایوسی اور خوف وہراس کو دور کرنے کیلئے حیات اللہ انصاری نے قومی آواز کے کالموں کے ذریعہ ان کے اندر ہمت وحوصلہ بیدار کرنے کی کوشش کی۔ مولانا آزاد کے بصیرت افروز خطاب نے مایوس مسلمانوں میں زندگی کی نئی روح پھونک دی۔ رفیع احمد قدوائی اور پنڈت جواہر لعل نہرو کے سیاسی تدبیر کے ساتھ حیات اللہ انصاری نے قومی آواز کے اداریوں کے ذریعہ قابل تحسین اثرات ڈالے جس کا اعتراف پورے ملک میں کیا گیا۔

اُردو کی بقا اور ترقی کی کوششوں میں قومی آواز کے کردار کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو کے مخالف ذہنوں کے خلاف قومی آواز نے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا۔ پُر امن اور آئینی محاذ کھولے۔ ریاست اتر پردیش میں اُردو کی حمایت میں 22/لاکھ دستخطوں کے ذریعہ مختصر نام، صدرِ جمہوریہ کو پیش کیا گیا۔ اُردو کے اس دستخطی مہم کو کون فراموش کر سکتا ہے جو ڈاکٹر ذاکر حسین اور قاضی عبدالغفار جیسے قوم پرست رہنماؤں کی قیادت میں چلائی گئی تھی۔ اس تحریک کو عوامی حمایت دلانے میں قومی آواز کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے ظاہر ہے کہ حیات اللہ انصاری کی صحافتی خدمات اور ان کے کارناموں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جس نے اُردو صحافت کو نئی سمت کے ساتھ بین الاقوامی معیار بخشا۔ ان کی ان خدمات کے پیش نظر انہیں اُردو صحافت کا معمار اعظم کہنا بے جا نہ ہوگا۔

استفادہ:

(۱) اُردو صحافت میں حیات اللہ انصاری کی پہل کاریاں۔ گربچن چندن۔

(۲) اُردو صحافت اور قومی آواز۔ خلیق انجم

❑❑❑

التماس

"ماہنامہ نیادور" کو ارسال کیے جانے والے مضامین اور تخلیقات کا معیاری ہونا ضروری ہے اور مسودات کمپوز شدہ، مکمل ایڈریس، موبائل نمبر اور تصویر کے ساتھ ہونا لازمی ہے۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں اشاعت ممکن نہیں ہوگی۔

ادارہ--

پروفیسر عابد حسین حیدری

سابق پرنسپل وصدر شعبۂ اردو ایم جی ایم پوسٹ گریجویٹ کالج، سنبھل

9411097150

بچوں کا ادب اور فاطمہ وصیہ جائسی

اردو میں بچوں کے ادب کی بہت قدیم روایت ہے۔ امیر خسرو سے لے کر مولانا محمد حسین آزاد اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی نظموں اور ان کی درسی کتب سے اس کی مضبوط روایت کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے لیکن افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے تخلیق کاروں نے تو اس پر بھرپور توجہ دی کہ بچوں کا ادب تخلیق ہونا چاہیے لیکن ہمارے ناقدین نے اس سے بے اعتنائی برتی۔ میرے مندرج جملوں کی تصدیق خوشحال زیدی نے بھی کی ہے۔ انھوں نے لکھا:

> ”تعجب کی بات ہے کہ اردو میں امیر خسرو تاحال ہر بڑے لکھنے والے نے بچوں کی تعلیم وتربیت پر توجہ دی ہے لیکن اردو کے ناقدین ومبصرین نے اردو ادب اطفال کو ہمیشہ نظرانداز کیا ہے۔“[1]

آزادی کے بعد ادب اطفال پر خصوصی توجہ دی جانے لگی اور ہمارے تخلیق کاروں کی ان کاوشات کو تنقیدی کسوٹی پر پرکھنے کا عمل بھی شروع ہوا۔ اس کوشش میں بچوں کے ادب کی تخلیقات میں رنگارنگی آئی۔ داستانی واساطیری کہانیوں کے علاوہ ڈرامہ، مختصر کہانیاں، چٹکلے اور باتصویر کا عکس کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی خاطرخواہ مواد سامنے آیا۔ کھلونا، پیام تعلیم، کلیاں، پھلواری، امنگ، بچوں کی نرالی دنیا جیسے درجنوں رسائل نے بچوں کے ادب کو خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ مذکورہ رسائل میں خواتین تخلیق کاروں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور انھوں نے بھی اپنی کہانیوں اور نظموں سے اردو ادب کے دامن کو مالامال کیا۔ اس طرح خواجہ حسن نظامی کی اہلیہ خواجہ لیلیٰ بانو، حجاب امتیاز علی، رضیہ سجاد ظہیر، مسعودہ حیات، کشور ناہید، نورجہاں نور، بانو سرتاج، بیگم ممتاز مرزا، قمر قدیر ارم مرادآبادی، ڈاکٹر کشور جہاں زیدی، بلقیس ظفیر الحسن، صالحہ عابد حسین، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، اے آر خاتون، عفت موہانی، قدسیہ بانو، شفیقہ فرحت، عطیہ پروین، فوزیہ چودھری اور صادقہ نواب سحر جیسی سیکڑوں خواتین تخلیق کاروں نے ادب اطفال کا معتدبہ ذخیرہ اردو ادب کے دامن میں بھر دیا۔ ان میں اکثر تخلیق کاروں نے فکشن، شاعری، تنقید، انشائیہ، ڈرامہ جیسی اصناف میں اپنے نقش ثبت کیے ہیں اور اردو کی بیشتر اصناف ان کے ذکر کے بغیر نامکمل محسوس ہوتا ہے۔

آزادی کے بعد جن خواتین نے اپنی شاعری سے خصوصاً جدیدیت کے دور میں اپنی شناخت قائم کی ان میں لکھنوی تہذیب کی نمائندہ شاعرہ فاطمہ وصیہ جائسی ہیں، جنھوں نے اپنی نظموں، غزلوں، سلاموں، مرثیوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب پر بھی کام کیا ہے۔ وہ اودھ کی اس سرزمین سے تعلق رکھتی ہیں جہاں ملک محمد جائسی، خطیب اعظم مولانا سبط حسن، کامل جائسی، مانی جائسی اور شاہ حسن علی جائسی جیسے تخلیق کار، علما وشعرا پیدا ہوئے۔ فاطمہ وصیہ جائسی نے بھی ایک جگہ اپنی اس علمی وادبی بستی کا گن گان کیا ہے:

میں سب کو دیتی ہوں ایثار وخلق کی دعوت	مری نواؤں میں پنہاں ہے جذب پدماوت
ہے مجھ کو فخر کہ میرا بھی ہے وطن جائس	جہاں کے لوگوں نے بانٹی ہے پیار کی دولت

فاطمہ وصیہ جائسی ۱۰/ستمبر ۱۹۴۰ء کو جائس ضلع رائے بریلی (اترپردیش) میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۵۰ء میں اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ آئیں اور شہر لکھنؤ ان کی تعلیم وتربیت کا محور ومرکز بننے کے ساتھ ان کی شناخت بھی بنا۔ وہ لکھنوی تہذیب وثقافت کی نمائندہ تھیں۔ شرافت ونجابت کی امین فاطمہ وصیہ جائسی سراپا انکسار کا نمونہ تھیں۔ شہر لکھنؤ کا ہر شخص انھیں احترام سے باجی کہتا تھا۔ ۱۵/جنوری ۲۰۰۱ء میں راقم الحروف کا تقرر ایم جی ایم پوسٹ گریجویٹ کالج سنبھل میں بحیثیت اردو استاد ہوا۔ بہت خوش ہوئیں اور کہا کہ ہم لوگوں کو بھول مت جانا۔ میں نے کہا باجی لکھنؤ کو میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ میں نے بھی اسی شہر کی فضا میں پرورش پائی ہے۔

> ”بچپن کی زیادہ تر نظمیں کھلونا (دہلی)، پھلواری (دہلی) اور کلیاں (لکھنؤ) میں شائع ہوئی ہیں، ان کی نظم ”گڑیا“ آئینہ (دہلی) میں ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی اور اسی ہفتہ وار اخبار میں فاطمہ وصیہ جائسی کی نظم کے ساتھ مجاز کی موت کی خبر بھی شائع ہوئی تھی، جن کا انتقال ۵/دسمبر ۱۹۵۵ء کو ہوا تھا۔ انھوں نے بچپن کا مقدمہ ”پیارے بچو“ کے عنوان سے لکھا ہے، جس میں انھوں نے بچوں کو بہت سی نصیحتیں بھی کی ہیں اور ان نصیحتوں میں ان کی زندگی کی محنت ومشقت اور حالات پریشاں کی ٹھیس بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس تذکرہ میں انھوں نے اپنے بھائی مرکزی وزیر وسابق گورنر سید سبط رضی کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ سیاست داں ہونے کے پہلے ایک صحافی تھے، ساتھ ہی بہترین خطیب اور عمدہ مرثیہ خواں بھی تھے۔“

مئی اور جون کی چھٹیوں میں میرا زیادہ وقت لکھنؤ میں گزرتا تھا اور اپنی مادر علمی سلطان المدارس میں قیام رہتا تھا۔ اتفاق سے ۱۳؍جون ۲۰۰۷ کو برادر مکرم میر نظیر باقری بھی لکھنؤ آئے اور مجھے حکم ہوا کہ چلو وصیہ باجی کے یہاں چلتے ہیں اور ہم دونوں وصیہ باجی کے یہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے برما کے بسکٹ اور چائے سے ضیافت کے ساتھ دعائیں دیں اور کہا کہ بہت اچھا ہوا آپ دونوں آگئے اور انھوں نے اس درمیان اپنا مجموعہ ''روبرو'' اور ادب اطفال پر مشتمل نظموں کا مجموعہ ''بچپن'' بھی از راہ کرم عنایت فرمایا۔ ''بچپن کے اندرونی صفحہ پر لکھا — دعاؤں کے ساتھ۔ عابد حیدری کے لیے۔ فاطمہ وصیہ جائسی۔ ۱۳؍جون ۲۰۰۷ء—'' اس سے قبل ان کے مجموعہ ہائے کلام (۱) ریزہ ریزہ حیات مطبوعہ ۱۹۸۳ء (۲) قطرہ قطرہ سمندر مطبوعہ ۱۹۸۶ء (۳) کرچ کرچ زندگی مطبوعہ ۱۹۸۸ء (۴) طرز گفتگو مطبوعہ ۱۹۹۰ء (۵) تمنائے فاطمہ مطبوعہ ۱۹۹۷ء (۶) معراج قلم مطبوعہ ۱۹۹۲ء میری لکھنوی زندگی میں شائع ہو چکے تھے اور میری نظر سے گزر چکے تھے لیکن ''بچپن'' ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا اور ''روبرو'' جو ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا تھا میرے مطالعہ میں نہیں آئے تھے۔ ''بچپن'' کو دیکھ کر میں نے سوال کیا باجی آپ نے بچوں کی نظمیں بھی لکھی ہیں، انھوں نے جواب دیا مجموعہ آپ کے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کے لیے ''پھلواری'' کے نام سے کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ متذکرہ تصنیفات کے علاوہ وصیہ باجی نے دعائے علی (مرثیہ و رباعی)، تاثر (مضامین)، شعرائے جائس (جس میں شاعرات کا بھی تذکرہ تھا) مرتب کرلیا تھا۔ پتہ نہیں ان کے ورثاء نے مذکورہ مسودات کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ بچپن کے مطالعہ کے بعد مجھے حیرت ہوئی کہ ادب اطفال پر کام کرنے والوں نے وصیہ باجی کو کیسے نظر انداز کیا، جب کہ ان کی نظمیں فنی اعتبار سے صف اول کی حامل ہیں جن میں حب الوطنی اور قومی یکجہتی کے گیت گائے گئے ہیں اور بچوں کو قومی تہواروں اور قومی شخصیات سے متعارف کرایا گیا ہے۔ فاطمہ وصیہ جائسی ایک قادر الکلام معتبر شاعرہ ہیں اور انھوں نے اپنی نظموں، غزلوں، نوحوں، سلاموں، مرثیوں کے ساتھ ساتھ ادب اطفال پر بھی نظمیں لکھیں۔ انھوں نے یہ نظمیں اپنے بچپن میں لکھی تھیں، انھوں نے لکھا ہے کہ:

''یہ سب نظمیں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۷ء تک کے زمانے کو محدود کرتی ہیں۔ جب میں ذرا سمجھدار ہوئی تو اپنے ملک کو آزادی کی لہروں میں لپٹا ہوا پایا۔ ہر طرف آزادی کے نعرے گونج رہے تھے۔''[۲]

جس ماحول میں فاطمہ وصیہ جائسی کی پرورش و پرداخت ہوئی، وہ غیر منقسم ہندوستان تھا اور ہر طرف آزادی کے نعرے گونج رہے تھے۔ انگریزی سامراج پریشان تھا۔ گاندھی، نہرو، ابوالکلام آزاد، سردار پٹیل، سبھاش چندر بوس کی تقریریں اور مولانا محمد علی جوہرؔ، رام پرشاد بسمل اور حسرت موہانی کے نغمے فضا میں بکھرے ہوئے تھے اور سبھی دیش واسی اپنے ملک کو آزاد کرانے کی سعی کر رہے تھے۔ یہ وہ ماحول تھا کہ ہندوستان کا بچہ بچہ گاندھی اور نہرو کے گن گا رہا تھا، خصوصاً نہرو جی جدوجہد آزادی کے سلسلے میں قید و بند کی صعوبت برداشت کرنے کے باوجود بچوں سے بہت پیار کرتے تھے، اسی لیے بچے انھیں چاچا نہرو کے نام سے یاد کرتے تھے۔ فاطمہ وصیہ جائسی نے نہرو کو دیکھا تھا اور جب وہ لکھنؤ آئے تو اس وقت ایک نظم ''جے جے نہرو جے جے چاچا'' کے عنوان سے کہی، جس کے دو بند پیش کیے جا رہے ہیں، جس سے نہرو کے تئیں فاطمہ وصیہ جائسی کے جذبات محسوس کیے جاسکتے ہیں:

دیش کی سیوا کرنے والے
دیش کی خاطر جینے والے
دیش کی خاطر مرنے والے
جے جے نہرو جے جے چاچا

اور اگلے بند میں فاطمہ وصیہ جائسی کا اپنے رہبر کے تئیں کیا گیا وعدہ ہر ہندوستانی بچے کا وعدہ محسوس ہوتا ہے:

ہم بھی اونچا نام کریں گے
دیش میں اچھا کام کریں گے
یہیں جئیں گے یہیں مریں گے
جے جے نہرو جے جے چاچا

فاطمہ وصیہ جائسی نے خود لکھا ہے کہ ''میں نے یہ نظمیں بچپن میں کہی ہیں، لہٰذا اس میں ہلکی پھلکی باتیں ہیں، جیسی کہ بچے کیا کرتے ہیں اور بچوں کو اچھی لگتی ہیں۔'' لیکن انھوں نے بچوں کو ان ہلکی پھلکی باتوں میں قومی یکجہتی کی تلقین اور ملک وقوم سے محبت کا درس دیا ہے ساتھ ہی یہ پیغام بھی دیا ہے کہ ''مجھے پڑھنے لکھنے والے بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔'' اسی لیے فاطمہ وصیہ جائسی کی نظموں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ماہر فن ہونے کے ساتھ ساتھ نفسیات پر خاصی گرفت رکھتی ہیں۔ ان کی نظموں کے موضوعات، زبان، الفاظ، بچوں کی روزمرہ بول چال میں مزاح کی چاشنی کے ساتھ اودھ کا تہذیبی پس منظر دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظمیں اپنی مذکورہ خوبیوں کی بنا پر ادب اطفال کی شاہکار تخلیق کا درجہ رکھتی ہیں۔

بچپن کی زیادہ تر نظمیں کھلونا (دہلی)، پھلواری (دہلی) اور کلیاں (لکھنؤ) میں شائع ہوئی ہیں، ان کی نظم ''گڑیا'' آئینہ (دہلی) میں ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی اور اسی ہفتہ وار اخبار میں فاطمہ وصیہ جائسی کی نظم کے ساتھ مجاز کی موت کی خبر بھی شائع ہوئی تھی، جن کا انتقال ۵؍دسمبر ۱۹۵۵ء کو ہوا تھا۔ انھوں نے بچپن کا مقدمہ ''پیارے بچو'' کے عنوان سے لکھا ہے، جس میں انھوں نے بچوں کو بہت سی نصیحتیں بھی کی ہیں اور ان نصیحتوں میں ان کی زندگی کی محنت ومشقت اور حالات پریشاں کی ٹیس بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس تذکرہ میں انھوں نے اپنے بھائی مرکزی وزیر وسابق گورنر سید سبط رضی کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ سیاست داں ہونے کے پہلے ایک صحافی تھے، ساتھ ہی بہترین خطیب اور عمدہ مرثیہ خواں بھی تھے۔ سید سبط رضی بچوں کے لیے بچوں کی دنیا اور کہکشاں نامی ماہنامہ نکالتے تھے جس میں فاطمہ وصیہ جائسی، قائم مہدی، محمدیہ خاتون اور مرزا محمد کاظم سابق او ایس ڈی اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ان رسالوں کے ادارتی ارکان میں شامل تھے۔ فاطمہ وصیہ جائسی نے بچوں کو اس بات کی ہدایت کی کہ:

''ہمیں علم کے ساتھ ساتھ ادب سے جڑا رہنا چاہیے ورنہ ہم اپنی طرز معاشرت کھودیں گے۔ یہ طریقہ قومی یکجہتی کے لیے بھی بہت ضروری ہے۔ اگر بچے اپنے کلچر کو سمجھ لیں تو پھر اس تہذیب کے اثرات نمایاں ہوں گے جو ہندوستان کی تہذیب ہے۔''[۳]

فاطمہ وصیہ جائسی سچی وطن پرست ہیں اور اپنے ملک کے ذرے ذرے سے انھیں محبت ہے۔ اسی لیے موصوفہ وطن عزیز ہندوستان کی ہر زبان اور ہر انسان سے محبت کرنا ضروری سمجھتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ:

''بغیر کسی تنگ نظری کے انسانوں سے محبت کرنا اور سب کو اپنا سمجھنا ہی توانسانیت ہے اور وہی سچا وطن پرست ہے جو پہلے وطن اور پھر وطن والوں سے محبت کرے۔'' ان کا یہ نظریہ تھا کہ ''جب وطن کی ہر چیز ہماری ہے تو اس کے بسنے والے کروڑوں انسان بھی ہمارے ہیں چاہے وہ کسی صوبے سے تعلق رکھتے ہوں، ان کی بھاشا کچھ بھی ہو طرز معاشرت کچھ ہو سب بھارت کی جان ہیں۔''[۴]

فاطمہ وصیہ جائسی کی مادری زبان اردو ہے۔ وہ خطہ اودھ کی بیٹی ہیں اور اسی آب وہوا کی

پروردہ ہیں لیکن وہ کسی بھی زبان سے نفرت کو بہت بڑا جرم سمجھتی ہیں۔ اپنی زبان سے محبت کے ساتھ دوسری زبانوں کے گیان کو وہ مثبت نظریہ کے تحت ضروری سمجھتی ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے:

''زبانوں سے نفرت کرنا تو بہت ہی بری بات ہے۔ زبان کا کوئی مذہب نہیں۔ ہر زبان سے محبت اور اس کو بولنے سمجھنے میں ہماری لیاقت بڑھتی ہے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔''۵

فاطمہ وصیہ جائسی کے متذکرہ نظریات کو ان کی نظموں میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بچوں میں انھیں نظریات کو راسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نظموں کے موضوعات کی بوقلمونی ہمیں اس ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی عکاس نظر آتی ہے، جس کے سبب ہمارا ملک آج بھی پوری دنیا میں امن وشانتی کے علمبردار کی حیثیت سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ ان کی نظم ''سب کا خدا ایک ہے'' میں فاطمہ وصیہ جائسی کے متذکرہ نظریات کو محسوس کیا جا سکتا ہے ساتھ ہی اس نظم کے کردار اور ان کی لفظیات قومی ایکتا کی نقیب محسوس ہوتی ہیں:

گھر کے آئی ہے کالی گھٹا   ہوگئی خوش وہ دیکھو لتا
ایک ہی سب کا ہے ایشور   ناؤ سب کی ترائے خدا
کوئی ہندو نہ مسلم کوئی   ہے کسی سے کوئی کب جدا
پیار بانٹیں چلو سب میں ہم   کوئی رہنے نہ پائے خفا
شانتی سارے جگ میں رہے   ہے وصیہ کی بس یہ دعا

درج بالا نظم کے علاوہ ''پیار کی ورشا، غبارے والا، ترکا مٹھو، دعا، چڑیا چہکیں، ریل، آئی دیوالی، میری امی، سب ہند کے واسی ہیں، کسان اور چلتے رہو'' جیسی نظموں میں وطن سے محبت اور ملک میں امن وشانتی کے پیغام کو بچوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نظم ''پیار کی ورشا'' میں مناظر قدرت اور مناظر فطرت کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔

دیکھو کیاری کیاری مہکی   ڈالی ڈالی کوئل چہکی
کہیں پپیہا کہیں ہے مور   پانی کا ہر سمت ہے شور
سب کے لب پر ہیں ترانے   دیکھو ہم بھی چلے ہیں گانے
یہاں پہ کوئی بڑا نہ چھوٹا   سب پر پانی ٹوٹ کے برسا
بھیگے راجہ پرجا سب ہی   کہیں دروغہ کہیں پہ منشی

اس منظر نامے میں بھی فاطمہ وصیہ جائسی نے پریم کا مارگ بچوں کو دکھایا ہے اور اسی پریم کے راستے انھیں بھارت کی ادبی وثقافتی وراثت سے واقف کرایا ہے:

پریم بھی چھوٹا بڑا نہ جانے   سب کو ایک سمان یہ مانے
رحمن اور رسکھان سے پوچھو   بنسی کی ہر تان سے پوچھو
پیار کی ورشا رم جھم برسے   اور کبھی یہ آن نہ ٹوٹے
کہیں مسلماں کہیں پہ ہندو   بھارت کے ماتھے کے بندو
ہند کے دونوں رکھوالے ہیں   ایک ہی دھن کے متوالے ہیں
بھید نہ کوئی بھاؤ ہے ان میں   سچ ہے کتنا چاؤ ہے ان میں

اسی طرح فاطمہ وصیہ جائسی کی ادب اطفال کی نظموں میں جگہ جگہ مزاح کا پہلو بھی دکھائی دیتا ہے۔ ترکا، اف یہ سردی، گڑیا سے شکایت، شگو رانی، آرزو، کام نہ آیا تو کیا ہوگا اور میری امی میں اس پہلو کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ''میری امی'' کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں اور سنجیدہ فاطمہ وصیہ جائسی کے اس منفرد رنگ کو بھی محسوس کریں:

امی کو ہر اک بات میں ملتے ہیں نشاں اور   پڑھنے جو نہ جائیں تو گزرتا ہے گماں اور
گر مدرسہ جانے کو نہ جی چاہے تو امی   کہتی ہیں کہ کچھ دن تو چلا جا مری جاں اور
آپا کی میں چوٹی کو بلاؤں گا پکڑ کے   ڈانٹیں گی جو مجھ کو تو دکھاؤں گا زباں اور
تھوڑی سی اگر پھاڑ دیں بھیا کی کتابیں   دیکھے گئے پھر منہ پہ طمانچوں کے نشاں اور
یوں تو مجھے کہہ لیتے ہیں پاپا بھی بہت کچھ   امی کے بگڑنے میں ہے کچھ لطف زباں اور
بے کار خفا ہوتی ہیں مجھ پر مری امی   حلوے کو بھلا جا کے چرائیں گے کہاں اور

اسی طرح ان کی نظم ''چڑیا مہکیں''، ''کسان'' اور ''آئی دیوالی'' خوبصورت نظمیں ہے۔ ''چڑیا چہکیں'' جہاں فضائی آلودگی سے اپنے ماحول کو پاک رکھنے کی عکاس ہے، وہیں بھارت کے کسان کو انھوں نے بھارت ماتا کی سنتان اور ساری زمینوں کا مالک قرار دیتے ہوئے اس کی عظمت کا گن گایا ہے:

لگا تار محنت کی دھن میں یہی ہے   یہ سچ ہے کہ بھرپور گن میں یہی ہے
یہ کھیتوں کی دنیا ہری ہے اسی سے   محبت کی دنیا بسی ہے اسی سے

فاطمہ وصیہ جائسی کے بچوں کے ادب کا مرکزی نکتہ محبت، امن، شانتی اور قومی ایکتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظم ''آئی دیوالی'' میں اپنے اس نظریہ کو مزید ابھارا ہے۔ دیوالی ہندوستان کا عظیم تیوہار ہے، جسے ہر ہندوستانی مل جل کر مناتے ہیں۔ قومی ایکتا کا علمبردار یہ ہندوستانی تیوہار اردو کے شاعروں کو بھی خوب بھایا اور نظیر اکبر آبادی سے لے کر موجودہ عہد کے ہر بڑے فنکار نے اس پر قلم اٹھایا ہے۔ فاطمہ وصیہ جائسی کے بھی دیوالی کے تعلق سے اشعار ملاحظہ فرمائیں اور بچوں کے لب ولہجہ پر ان کی گرفت اور حسن نظم کی داد دیں:

آئی دیوالی کرتی اجالا   ساتھ میں لائی پریم کا پیالا
جلتے دیپ ہیں کتنے پیارے   جیسے ہوں آکاش کے تارے
گھر گھر دیپک جلے ہوئے ہیں   کنول دلوں کے کھلے ہوئے ہیں
ہم بھی ایسے دیپ جلائیں   سارے جگ میں جوت جگائیں
گھر گھر میں اجیارا پھیلے   چاروں اور سندیسا پھیلے
ایک ترنگا ایک ترانہ   ایک کہانی ایک افسانہ
پھر کا ہے کی دھینگا مشتی   پھر کاہے کی ہیرا پھیری

اور فاطمہ وصیہ جائسی کی ''دعا'' بھی ہر ہندوستانی بچے کی دعا محسوس ہوتی ہے، جس میں ملک وقوم کی خوشحالی کے ساتھ اس کے مستقبل کا اشاریہ بھی ہے:

خدایا آرزوئے علم مجھ کو کامیابی دے
وطن کے کام آجاؤں مجھے اتنی ترقی دے
رہیں آپس میں مل جل کر ترانے امن کے گائیں
مرے حسن عمل سے سارے انساں ایک ہو جائیں

بہرحال فاطمہ وصیہ جائسی کے ادب اطفال کے منثورات اور شعریات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ادب اطفال کے ناقدین نے ان کی تخلیقات پر توجہ نہیں دی ہے جبکہ ان کی کہانیاں اور نظمیں ادب اطفال میں اعلیٰ درجہ کی تخلیقات کا درجہ رکھتی ہیں۔

حواشی:

(۱) خوشحال زیدی، اردو ادب میں خواتین کا حصہ، ص:۱۹، ادارہ بزم خضر راہ، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء
(۲) فاطمہ وصیہ جائسی، بچپن، ص:۶، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۹۳ء
(۳) ایضاً، ص:۱۱
(۴) ایضاً، ص:۱۱
(۵) ایضاً

□□□

ڈاکٹر رضوان انصاری
چار باغ، لکھنؤ
9918443200

اطفالِ ادب کے معمار: متین طارق

اردو ادب میں ادبِ اطفال پر اہلِ علم نے بہت کم توجہ دی۔ جس کی وجہ سے اس صنف میں تخلیقات کی بھی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ اردو شعراء نے بھی ادبِ اطفال پر مبنی اشعار کم ہی کہا ہے۔ عہدِ طفلی سے اسماعیل میرٹھی کا شعر دماغ میں گونجتا تھا کہ:

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

چونکہ عہد قدیم میں بلا تفریق مذہب وملت گائے کی پرورش ہوتی تھی اس لیے میرٹھی صاحب نے خداوند تعالیٰ کی اس مخلوق یعنی گائے کو نظم کر کے مذکورہ بالا شعر کو نظم کا جامہ عطا کیا۔ بحر بھی چھوٹا رکھا اور زبان بھی عام فہم اور رواں ہے۔ اس کے بعد شفیع الدین نیرؔ کا یہ شعر بھی ذہن وفکر کو متاثر کرتا رہا کہ:

بچہ کیوں بڑا ہو کر دنیا کے الم سہتا
نیرؔ جو زمانے میں بچپن ہی سدا رہتا

اس کے بعد عہدِ طفلی کو نظر میں رکھ کر اردو کے چند نامور شعراء نے اپنی اپنی نظموں میں بچوں پر اشعار کہے۔ جن میں خواجہ حالیؔ پانی پتی، حفیظ جالندھری، ڈاکٹر اقبال لاہوری، تلوک چند محروم اور افسرؔ میرٹھی وغیرہ نے اس صنف کو موضوعِ سخن بنایا۔ خواجہ حالیؔ کا شعر:

چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو

بہت مشہور ہوا۔ اور مقبولِ ہر خاص وعام ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

عصر حاضر میں متین طارق باغپتی بچوں کے ذہن وفکر کو نظر میں رکھ کر نظمیں کہی ہیں۔ چونکہ آپ پوری زندگی معلم تھے اور بچوں کے حرکات و سکنات نیز ان کی مزاج سے بخوبی واقف تھے اس لیے رواں زبان اور دلکش اسلوب میں نظمیں کہی ہیں۔ انہوں نے نثر اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کئے ہیں مگر موضوع صرف ادب اطفال اور ان کے ذہن وفکر کو مدنظر رکھا۔

جیسا کہ ما قبل تحریر کیا جا چکا ہے کہ متین طارق صاحب پوری زندگی درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ اس کے علاوہ ان کے والد بھی پیشہ معلمی کو ذریعہ عز وشرف بنائے رہے۔ انہوں نے بچوں کے نفسیات کو بہت قریب سے غور وفکر کیا اور ان کی اصلاح کرنا اپنا فرض یقین جانا۔ اس ضمن میں متین طارق صاحب رقم طراز ہیں:

> ”کسی بھی ملک کے رہنے والوں کے مستقبل کی تعمیر میں کتابوں کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ خصوصاً چھوٹے بچوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں تو یہ بات سو فیصد صحیح ہے۔ کیونکہ ابتدائی زندگی کے نقوش خواہ مسرت کے ہوں یا ملال کے۔ ہمیشہ گہرے ہوتے ہیں۔ بچوں کا دل معصوم اور دماغ سادہ تختہ سیاہ ہوتا ہے۔ ان پر جس طرح کے نقوش ڈالے جائیں گے اور جس طرح ان کی تربیت کی جائے گی اسی طرح کے اثرات مستقبل پر اثر انداز ہوں گے۔“
>
> (پیش لفظ بہارِ چمن، صفحہ:6)

متین طارق صاحب نے جن باتوں کی جانب بچوں کی اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی تربیت کی ضرورت پر خاص توجہ دلائی ہے وہ اپنی جگہ بہت اہم ہیں۔ وہ پوری زندگی بچوں کی نفسیات کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے ہمارا ادب بچوں کے ادب عالیہ سے بہت حد تک خالی ہے۔ اس کی وجوہات سے پردہ کشائی کرتے ہوئے متین طارق تحریر فرماتے ہیں:

”متین طارق کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ عمیق ہے۔ آپ کا مطالعہ قرآن بھی ہے۔ اسلامیات پر گہری نظر ہے۔ ہر نظم میں درس ہے۔ نثر و نظم پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور دونوں میں اپنی یادگار باقی رکھی ہے۔ ”راہِ حق کے مصائب اور ہماری ذمہ داریاں“ کتاب گو کہ کم اوراق پر مبنی ہے مگر اس میں اہم اہم شخصیتوں کی اسلام کا کلمہ پڑھنے کے بعد آنے والی پریشانیوں کا رقت آمیز اسلوب میں ذکر کیا گیا ہے جو ہوش خرد رکھنے والے طلبہ وطالبات نیز نو خیز عمر والوں کے لیے بڑی اہم کتاب ہے۔ اس کے علاوہ نئی عمر کے بچوں کے لیے دوسری کتاب ”سبق آموز کہانیاں“ بھی اردو نثر میں کم ورقی ہے۔ جو نہایت سبق آموز ہیں۔ کتاب کے مرتب ڈاکٹر خان محمد رضوان نے ہر کہانی کے خاتمہ پر بہت مختصر جملوں میں خلاصہ بیان کر دیا ہے جس سے طلبہ کو آسانی ہو گئی ہے۔“

”دراصل بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر انہیں کی زبان میں نظموں کی تخلیق کرنا بڑا نازک کام ہے۔اسی لیے بہت کم لوگ اس کام کی ہمت کر سکے ہیں۔ بچوں کی شاعری کا اسلوب محبت، اخلاق اور خدمات کے جذبات سے عبارت ہوتا ہے۔ان کے لئے ایسی نظمیں مفید ہو سکتی ہیں جو باہمی نفرت، تعصب اور تنگ دلی کو دور کرنے والی ہوں۔ان میں وطن دوستی اور بنی نوع انسان سے محبت کا جذبہ کارفرما ہو۔تاکہ آگے چل کر وہ اچھے شہری بن سکیں اور ملک و قوم کی تعمیر میں حصہ لے سکیں۔“

(پیش لفظ بہارِ چمن۔ص:7،متین طارق)

متین طارق صاحب نے جن باتوں کی جانب اپنے پیشِ لفظ میں توجہ مبذول کرائی ہے وہ ہر کسے باشد کے نصیب میں نہیں۔مدرس ہو کر بچوں کے نفسیات کو سمجھنا بڑا اہم کام ہے۔

متین طارق کثیرۃ التصانیف ادیب و شاعر تھے۔ان کو قدرت نے ادب اطفال کی تخلیق کے لیے دنیا میں بھیجا تھا۔انہوں نے اپنی کتابوں سے لڑکیوں کو بھی مخاطب کیا۔آپ کی مطبوعہ کتابیں درج ذیل ہیں:

ہماری زبان، گڑیا کی نظمیں، نیک بیویاں، اسلامی زندگی کے نشانِ راہ، بیٹی کے نام خطوط، گڈو کے نغمے، بہار چمن، اٹھارہ ستارے اور معلومات عامہ وغیرہ۔

ان تمام کتابوں کی زبان عام فہم ہے۔بچوں کی عمر اور شعور کو مدنظر رکھ کر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ آپ کو کبھی اپنی شہرت اور نام و نمود کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔اور نہ ہی ستائش کی پروا کی۔وہ مرزا غالبؔ کے اس شعر کے حقیقی پیکر تھے:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ

جناب متین طارق کو بچوں کے نفسیات سے گہرا شغف تھا۔وہ ان کے ذہن و فکر کو قبول کرنے والے موضوعات کا انتخاب کرتے اور ان پر بڑا آسان کلام کہتے تھے۔آپ کو یہ سعادت اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی وہ بھی پوری زندگی معلم طلبہ و طالبات رہے۔آپ حضرات ان کو صرف کتابوں سے ہی آشنا نہیں کرتے بلکہ ان کی اخلاقی تربیت بھی اپنے ذمہ ضروری جانتے تھے۔اس لیے بے شمار کتب تحریر کیں۔ان کی بچوں سے متعلق ایک منظوم کتاب ”بہار چمن“ ہے۔اس کے علاوہ نثر میں ”سبق آموز کہانیاں“ بھی ہیں۔ان دونوں کتب کا براہ راست تعلق بچوں سے ہے۔پہلی منظوم کتاب 53 عناوین پر مشتمل ہے۔جس میں 3 حمدیں اور 2 نعوت سے کتاب کا آغاز ہوا ہے۔ان کے علاوہ خدا کی بخششیں، ماں کا احترام، یہ دیس ہے ہمارا، میرا وطن، اے قوم کے سپوتو، مجاہد کا ترانہ، رفیقو! مگر تم نہ کچھ خوف کھانا، اے میرے جوانو! علم، علم کا ترانہ، سب سے بڑی عظمت، کتابیں، کامیاب لوگ، نغمہ عمل، پیغامِ عمل، آہنی عزم، محنت، ہمت، نصیحت، شیریں سخن، وہ بچپن کے دن، میرے پیارے بچو! اچھا لڑکا، لالچ کا پھل، چندا ماموں، میری سائیکل، آم، برسات کی بہار، صبح بہار آئی، آؤ بچو، تتلی، صبح کا وقت، سویرا ہو گیا، گلہری، بچہ اور چراغ، کوّا اور لومڑی، جھینگر اور شہد کی مکھی، جوہی اور چمیلی، میرا نام بچو! بتاؤ تو جانیں، بتاؤ میں کیا ہوں، باغ، نیا سال، کالی آندھی، طلوع سحر، شام بہار، بہار کا موسم، عزم سنگین اور دعا وغیرہ۔

شاہکار نظمیں مذکورہ عنوانات پر مبنی ہیں۔ان سب کا بچوں کے ذہن کو ترویج و ارتقاء کے منازل طے کرنے میں معاون ہیں۔ان نظموں میں بعض وطن اور کچھ علم کی اہمیت نیز ماں کی عزت و احترام کو واضح کرتے ہیں۔عہد طفلی ایک سادہ لوح کے مثل ہوتا ہے۔بچے کے دماغ میں جو بات نقش ہو جاتی ہے وہ کالحجر کے مثل کہا جاتا ہے۔یہ بالکل درست ہے۔زبان و بیان سادہ اور رواں ہے۔ بچوں کو پڑھنے اور ذہن نشیں کرنے میں یہ بہت معاون ہوتے ہیں۔

متین طارق نے جن جن عنوانات پر اشعار کہے ہیں۔ان پر چند شعر کہنا ہر کسے باشد کا کام نہیں۔وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ان کی اہمیت کا اعتراف بہت کم کیا گیا۔چنانچہ ان کی چند نظموں سے چند اشعار درج کرنا اور ان کی قادرِ زبان و بیان کو واضح کرنا مقصود ہے۔ثنا، عنوان، بہارِ چمن کا پہلا عنوان ہے۔شعر ملاحظہ ہوں:

اے خالق ہر دوسرا
تو نے ہمیں پیدا کیا
مشعل جلا کر دین کا
حق کا دکھایا راستہ

☆☆☆

راحت بھی دی عزت بھی دی
ماں باپ کی شفقت بھی دی
پھر اپنی بخشش سے ہمیں
ایمان کی دولت بھی دی

☆☆☆

اس کا تقاضا ہے یہی
اپنی تمنا ہے یہی
تیری اطاعت ہم کریں
جینے کا منشا ہے یہی

یہ نظم بہت مختصر ہے یعنی کل 5 بندوں پر مشتمل ہے۔بحر بھی چھوٹی ہے۔سچ بات تو یہ ہے کہ نظم کے آخر میں جو شعر کہا ہے وہ قرآن پاک کی ایک آیت کا بڑا پُر تاثیر ترجمہ بھی ہے۔شاعر کا کمال یہی ہے۔ حمد کے عنوان سے 2 ہیں۔جس کا بحر اور کلام بچوں کے ذہن کو مدنظر رکھ کر کہا گیا ہے۔چند اشعار سے لطف اندوز ہوں:

تو نے بنائی دنیا ساری
انسان حیواں مٹی پانی
پھول کھلائے پیارے پیارے
اور بنائے چاند ستارے
بخشے ہم کو اماں ابا
گھر بھی دیا ہے اچھا اچھا
میٹھا میٹھا دودھ پلایا
پڑھنا لکھنا خوب سکھایا
میرے مالک میرے آقا
اللہ اللہ اللہ اللہ

☆☆☆

یہ طائرانِ خوش نوا
یہ سبزہ زار دلربا
یہ کوہسار پُر فضا
بنانا سب کا بے گماں
خدا کا میرے کام ہے
بڑا اسی کا نام ہے

کتاب میں حمد کے بعد نعت پاک کی شمولیت لازمی ہوتی ہے۔نعت پاک کے ضمن میں علامہ شیخ سعدی شیرازی نے بڑی پیاری اور آخری بات کہہ دی ہے کہ:

لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ
بعد از خدا بزرگ توی قصہ مختصر

متین طارق نے ''محمد رسول اللہؐ'' کے عنوان سے ایک موضوع پر اشعار نظم کیا ہے مگر یہ تقدیسی کلام روایتی اشعار پر مبنی نہیں۔بلکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے دنیا اور اہلِ دنیا کو کیا فوائد ملے۔ان تمام کا بیان بڑا والہانہ انداز میں کیا ہے۔رب تعالیٰ نے حضور کو مبعوث فرما کر مومنوں پر احسانِ عظیم قرار دیا ہے۔اسی بات کو پیش نظر رکھ کر اشعار کہنے کی کامیاب سعی کی گئی ہے۔ قارئین کی نذر چند اشعار ہیں:

ضلالت کے فتنے مچلتے یہاں
ہر اک سمت شیطان بستے یہاں
کوئی اپنی بستی نہ پہچانتا
خدا کو نہ مالک کوئی جانتا
گھٹائیں نہ چھٹتیں کبھی کفر کی
مسلط دماغوں پہ رہتی بدی
نہ نیکی کی ہوتی کسی کو خبر
سمجھتا نہ قیمت کو اپنی بشر
نہ کمزور کو چین ہوتا نصیب
غلاموں کا بنتا نہ کوئی حبیب
مگر ہے خدا کا یہ کتنا کرم
رکھا اس نے انسانیت کا بھرم
جہاں میں محمدؐ کو پیدا کیا
یہاں جس نے دی حق کی مشعل جلا

راقم الحروف نے علم پر متعدد نظمیں پڑھی ہیں۔مگر ان میں علم کی برکت ارو علم کے ضمن میں بے شمار فضائل ہی بیان کئے گئے ہیں۔میرے بچپن میں علم کی خوبی یہ بیان کی گئی تھی کہ علم وہ دولت ہے کہ چور چوری نہیں کرسکتا۔بھائیوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔آگ جلا نہیں سکتی۔ پانی ڈبو نہیں سکتا وغیرہ۔

مگر متین طارق نے علم کو ایک فرد کی شکل میں پیش کر کے اس سے باتیں کرنے کا شعور عطا کیا ہے۔وہ جس انداز میں علم سے حاصل ہونے والی باتیں کرتے ہیں وہ بہت دلکش اور بچوں کے ذہن وفکر کو قبول کرنے والی ہیں۔آئیے چند اشعار سے متین طارق کے پرواز علم کا اندازہ لگائیں:

مرے پیارے بچو! سنو دھیان دے کر
مجھے علم کہتے ہیں میں ہوں وہ جوہر
مرے دم سے تہذیب کی روشنی ہے
کرم سے مرے زندگی، زندگی ہے
میں رکھتا ہوں دانائی کا تاج سر پر
حقیقت میں کرتا ہوں دل کو منور
تمدن کی رونق کو میں نے جلا دی
بنی نوع آدم کی عزت بڑھا دی
ادب ہوں ہنر ہوں حسنِ بیاں ہوں
زمانے میں یعنی متاعِ گراں ہوں

مجھے فضل و حکمت کا سرتاج سمجھو
ترقی کے زینے کی معراج سمجھو
جو طالب مرا دل سے ہوکر رہے گا
وہ دنیا کی آنکھوں کا تارا بنے گا

وطن کی عظمت پر متعدد شعراء نے نظمیں لکھ کر اپنی طبع رواں اور فکر رسا کا پتہ دیا ہے۔ڈاکٹر اقبال لاہوری برج نارائن چکبستؔ لکھنوی اور مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔مگر ان کی نظموں کے قاری کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔

وطن کی عظمت کا ذکر اسلام اور بانی اسلام نیز حدیثِ پاک میں ملتا ہے۔وطن سے محبت نصف ایمان بتایا گیا ہے۔متین طارق نے وطن کی عظمت کے گُن گائے ہیں۔مگر ہر شعر میں یہاں کی خوبیوں کا ذکر کر کے بچوں کے ذہن کو وطن کی بڑائی پر یقین دلایا ہے۔متین صاحب کی نظموں کی خوبی یہ کہ وہ مسلم کرداروں کو اپنے اشعار میں نظم کرتے ہیں اور ان کے اوصاف حسنہ کو شعر کا جامہ عطا کرنے میں کمال تامہ کا مظاہرہ فرماتے ہیں۔وطن پر چند اشعار دیکھئے:

جو فخر آسماں جانِ جہاں ہے
ہمالہ جس کی عظمت کا نشاں ہے
وہی میرا وطن ہندوستاں ہے
جہاں باغوں میں کوعمل کوکتی ہے
ہوا کلیوں کے منھ کو چومتی ہے
وہی میرا وطن ہندوستاں ہے
گڑے ہیں جس کی مٹی میں دفینے
چھپے ہیں جس کی کانوں میں خزینے
وہی میرا وطن ہندوستاں ہے
جسے کہتے ہیں سب سونے کی چڑیا
زمیں جس کی ہے جنت کا نمونہ
وہی میرا وطن ہندوستاں ہے
جہاں ہوتے ہیں موسم بھی سہانے
جہاں ملتے ہیں پھل میٹھے رسیلے
وہی میرا وطن ہندوستاں ہے
جہاں ٹیپو ہوئے حیدر ہوئے ہیں
جہاں حسرت ہوئے جوہر ہوئے ہیں
وہی میرا وطن ہندوستاں ہے
جہاں پانی بھی امرت سے سوا ہے
جہاں کی خاک طارق کیمیا ہے
وہی میرا وطن ہندوستاں ہے

یہ نظم 13 بندوں پر مشتمل ہے۔ہر بند میں ملک ہندوستان کے اوصاف حمیدہ کا ذکر ملتا ہے۔ یہی نظم کی خوبی بھی ہے۔

بہارِ چمن میں ایک نظم ''شیریں سخن'' کے عنوان سے ہے۔اس نظم میں بچوں کو بتایا گیا ہے کہ ہمیشہ میٹھی بات کرنا چاہئے۔یہ آپس کی دشمنی کو ختم کر کے ایک دوسرے کو دوست بنا دیتی ہے۔ جس آدمی میں یہ خوبی ہوتی ہے اسے ہر آدمی اپنا عزیز بنا لیتا ہے۔نظم سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عزیز! ذرا اس طرف دھیان دو
توجہ سے تم بات میری سنو

اگر ہے یہ خواہش کہ ہو نیک نام
تو سب سے کرو تم بہ نرمی کلام
ملاقی ہے یہ دشمنوں کو گلے
مٹاتی ہے آپس کے سب تفرقے
اگر تم بھی اس گُن کو اپناؤ گے
تو راحت کا شیریں ثمر پاؤ گے

متین طارق کی ایک نظم ''وہ بچپن کے دن'' کے عنوان سے ہے۔ راقم نے آغاز مقالہ میں شفیع الدین نیر کی نظم ''بچپن'' سے ایک شعر درج کی ہے۔ ان کا خیال طارق صاحب نے بڑے پیارے اسلوب میں پیش کیا ہے۔ اس نظم سے مزید ایک بند کے ساتھ وہ بند درج ہے۔ ملاحظہ ہو:

وہ ہر روز لڑکوں کا مکتب سے آکر
نکلنا گھروں سے بہانے بنا کر
وہ مل جل کے پھر سب کا باغوں میں جا کر
وہ آموں کے موسم میں دھومیں مچانا
مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ
وہ دن عید کے اب نہ آئیں گے طارق
وہ لمحے نہ اب منھ دکھائیں گے طارق
مگر کیسے ہم بھول جائیں گے طارق
وہ ہنسنا ہنسانا وہ باتیں بنانا
مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ

متین طارق کے شعور وفکر میں ایسے ایسے موضوعات آنا اور ان پر برمحل اشعار کہہ دینا یقینی طور پر قابل داد ہے ان کے علاوہ قادر الکلام ہونے کی دلیل بھی ہے۔

نظامی عروضی سرقندی نے چہار مقالہ میں شاعر ہونے کے لیے جن شرائط کا ذکر کیا ہے وہ تمام شرائط متین طارق میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ ان کو قدماء کے بے شمار اشعار ازبر تھے۔ وہ ان کے معنی ومطالب سے بخوبی آگاہ تھے۔ شاعری کے اسرار و رموز سے کماحقہٗ واقف تھے۔ ان میں شعر کہنے اور بچوں کے نفسیات کا گہرا علم تھا۔ اور شعر وشاعری کا پورا ملکہ رکھتے تھے۔

ان کی نظم ''بچہ اور چراغ'' کل 17 اشعار پر مشتمل ہے۔ ان میں گہرے فکر کی غمازی ملتی ہے۔ یہ نظم خود میں ایک شاہکار ہے۔ فکر کی جولانی اور الفاظ کے ذرو بست دیکھتے ہی بنتا ہے۔ نظم سے اشعار پیش ہیں:

میں کیا ہوں ایک مٹی کا دیا ہوں
جہاں میں نور ہوں حق کی ضیا ہوں
ہمیشہ ہوں چمکتا جگ مگاتا
اندھیرے گھر میں کرتا ہوں اُجالا
جہاں میں ہے اسی سے میری عزت
کہ میں کرتا ہوں انسانوں کی خدمت
اگر تم بھی یہاں کچھ نام چاہو
تو پھر میری طرح دنیا میں چمکو
اندھیرے میں نہ جب کچھ دے دکھائی
کرو اہل جہاں کی رہنمائی
چمک کر راستہ سب کو دکھا دو
بری باتوں سے دنیا کو بچاؤ

کہ یہ مومن کا فرض اوّلیں ہے
بڑی اس سے کوئی دولت نہیں ہے

متین طارق کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ عمیق ہے۔ آپ کا مطالعہ قرآن بھی ہے۔ اسلامیات پر گہری نظر ہے۔ ہر نظم میں درس ہے۔ نثر ونظم پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور دونوں میں اپنی یادگار باقی رکھی ہے۔ ''راہِ حق کے مصائب اور ہماری ذمہ داریاں'' کتاب گو کہ کم اوراق پر مبنی ہے مگر اس میں اہم اہم شخصیتوں کی اسلام کا کلمہ پڑھنے کے بعد آنے والی پریشانیوں کا رقت آمیز اسلوب میں ذکر کیا گیا ہے جو ہوش خرد رکھنے والے طلبہ وطالبات نیز نوخیز عمر والوں کے لیے بڑی اہم کتاب ہے۔

اس کے علاوہ نئی عمر کے بچوں کے لیے دوسری کتاب ''سبق آموز کہانیاں'' بھی اردو نثر میں کم ورقی ہے۔ جو نہایت سبق آموز ہیں۔ کتاب کے مرتب ڈاکٹر خان محمد رضوان نے ہر کہانی کے خاتمہ پر بہت مختصر جملوں میں خلاصہ بیان کر دیا ہے جس سے طلبہ کو آسانی ہوگئی ہے۔ مقالہ کی طوالت کو مدنظر رکھ کر ان کہانیوں پر روشنی نہیں ڈالی جارہی ہے۔ یہ کہانیاں کل 14 ہیں جو پہلی بار ''مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز'' نے عمدہ کاغذ اور طباعت کے ساتھ منظر عام پر ہے۔ یہ قابل تحسین اور لائق تقلید عمل ہے۔

اتر پردیش کے نوجوان طلبہ وطالبات متین طارق کی ادبی تخلیقات سے ناآشنا ہیں۔ دراصل ان کی تحریر کردہ کتب داخلی درس نہیں۔ امدادی نصاب میں بھی شامل نہیں۔ اس وجہ سے وہ وطن دوستی، علم کی اہمیت وغیرہ اوصاف سے ناواقف رہ گئے۔ اور وہ بے راہ رو ہوکے رہ گئے۔ متین طارق علم وعمل کے پیکر تھے وہ اسلام آشنا اور اس کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا تھے۔ اس ضمن میں کنور مبارک علی کا یہ جملہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ دیکھئے:

> ''محترم متین طارق صاحب باغبت کے ایک علمی و ادبی اور مذہبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے نورانی اور پرخلوص چہرے کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ علم و ہنر اور خلوص کا سمندر ہیں۔ متین طارق اردو ادب و شاعری کا ایک ایسا نام ہے۔ جنہیں کبھی بھی شہرت اور نام ونمود کی چاہت نہیں رہی۔ وہ خاموشی کے ساتھ باغپت جیسے پرسکون ماحول میں رہ کر ایسا کام کرتے رہے۔ موصوف جس طرح ذاتی زندگی میں صالح اقدار اور اسلامی شعور کے حامل ہیں۔ بالکل اسی طرح ان کی شاعری اور نثر نگاری سنجیدہ ومقصدی اور صالح قدروں کی آئینہ دار ہے۔''

(راہِ حق کے مصائب، پشت)

متذکرہ اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ متین طارق ایک قادر الکلام نیز دیدہ ور شاعر تھے۔ ان کے ساتھ نثر نگاری میں بھی کمال تامہ رکھتے تھے۔ مبارک علی نے ان کے جن اوصاف کا ذکر کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔

متین طارق کے صاحبزادہ ذکی طارق ایک صاحب علم اعلیٰ فکر کے حامل دانشور ہیں۔ وہ خود بھی معلم وقرطاس سے گہرا رشتہ رکھتے ہیں۔ علم وادب سے برابر رابطہ ہے۔ عصر حاضر کے نوجوانوں میں جس طرح کی کمی کا احساس آپ کو ہے اس کا بیان وہ نہ کرکے اپنے والد کی اخلاقیات اور وطن دوستی پر مبنی کتابوں پر مقالے تحریر کرانا نیز ان کو شائع کرانا زندگی کا جزو لاینفک بنالیا ہے۔ یہی ان کی بہترین خراج عقیدت ہے۔

حاصل کلام یہ کہ متین طارق نفسیات کے ماہر دانشور شاعر وادیب ہوئے ہیں۔ آپ نے بچوں اور نوجوانوں کی زندگی میں انقلاب آفریں تخلیقات پیش کرکے بڑا اہم کارنامہ انجام دیا ہے اور مستقبل کے نونہالوں کو لاجواب تصنیف تحریر کرکے ماضی کی کمی کو ختم کر دیا ہے۔

خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھے۔

❑❑❑

کوثر صدیقی

بھوپال

9926404171

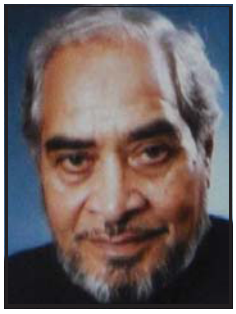

ف ۔س ۔اعجاز اپنا جواب آپ

کلکتہ میں اُردو کی شجرکاری کا آغاز سن 1800ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے ہُوا۔ اِس کے انکُر بھی پوری طرح نہیں پھوٹے تھے کہ سن 1828ء میں مرزا غالب دہلی کی زعفران زار نرسری سے اُردو کے مہکتے ہوئے پودے لے کر آگئے اور قریب ایک سال تک اُن کی آب پاشی بھی کرتے رہے۔ مرزا غالب کے لگائے یہ پودے اپنی جڑیں جما ہی رہے تھے کہ 1856 میں نواب واجد علی شاہ اختر لکھنو کے گلشن اُردو ادب سے غزل کے لکھنوی انداز کے مہکتے ہوئے گلاب کے ساتھ ناٹک، ڈرامہ اور رقص وسرور کی رنگین شامیں بھی لے آئے۔ ان دو ہستیوں نے کلکتہ ہی نہیں پورے بنگال میں اُردو کی ایسی شجرکاری کی کہ تناور درخت کی شکل میں آج تک موجود ہیں اور رہ رواِن شعر وادب کو سایہ بھی دے رہے ہیں اور نئی پود بھی تیار کر رہے ہیں۔ کلکتہ کے اس گلشن علم وادب میں باہر سے بھی علماء فضلاء آتے رہے ہیں اور یہاں بھی پیدا ہوتے رہے۔ باہر سے آنے والے گلہائے ہفت رنگ میں ایک گل ہفت رنگ وبو کا نام ف۔س۔اعجاز ہے جن کا تعلق ''دلّی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب'' سے ہے جو اوائل عمر ہی میں کلکتہ آگئے تھے اور یہیں کی آب وہوا اور زمین میں پھل پھول رہے ہیں۔

''اعجاز صاحب کا طائر فکر ونظر پابند شعری اصناف کی قید وبند ''تنگ نامے'' سے آزاد ہو کر کھلی فضا میں پرواز کرتا ہوا نظر آتا ہے تو اُسے وسیع وعریض دُنیا کے نظارے سے وہ موضوعات نظر آتے ہیں جو سطح پر چلنے والے کو نہیں دکھے''۔ سب میرے جنازے تھے، پلُوٹو بنام پلُوٹو، اُسامہ مصلحت سمجھو، بزدل، کس کے لیے تھا، کلکتہ ایک مِس کیریج، بسنت، جھوٹا دعویٰ، سات کوّا نظمیں وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو صرف آزاد نظم کے فریم ہی میں جڑی جاسکتی ہیں اور جڑنے والا ف۔س۔اعجاز ہو تو وہ کسی میوزیم میں نایاب آرٹ پیس میں رکھی جاسکتی ہیں۔ اعجاز صاحب کا زاویۂ نگاہ اور طرزِ سخن اپنے ہم عصر قلم کاروں سے اِس لیے جُدا ہے کہ وہ جہاں گرد ہیں۔ ایشیا اور یورپ کے چند ممالک کی خاک چھان کر اُس سے برآمد ہیرے موتی سے اپنے کلام کی مرصع سازی کرتے ہیں۔''

ف۔س۔اعجاز (اعجاز صاحب) ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس میں کئی شخصیات ضم ہیں۔ کاغذ قلم اور تحقیق ادب سے تعلق آغاز شباب سے پہلے ہی قائم ہوگیا تھا اور جب سے آج تک اپنی خود کی رہنمائی میں تخلیقی سفر بلا تکان جاری کیے ہوئے ہیں۔

اعجاز صاحب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اُنہوں نے خود کو کسی ایک صنف سے باندھ کر نہیں رکھا۔ غزل، نظم (پابند اور آزاد، دونوں) گیت، افسانہ، تحقیق، تنقید، ترجمہ نگاری، سفرنامہ نگاری، صحافت وغیرہ اصناف پر آپ کا اشہب قلم اپنی جولانیاں دکھانے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے اور دکھاتا بھی ہے۔ تخلیق ادب کے علاوہ آپ ایک اعلیٰ ادبی ماہنامہ ''انشاء'' کی ترتیب، ادارت اور اشاعت بھی کر رہے ہیں۔ عام روش سے ہٹ کر وقتاً فوقتاً خصوصی شمارے بھی نکالتے رہتے ہیں جو اُردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علاوہ انشاء اور اُس کے خصوصی شماروں کی اشاعت کے بقول آپ ہی کے مختلف اصناف اور موضوعات کے اب تک (2023 آخر) ''30 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ غزلوں، نظموں، گیتوں کے کئی مجموعوں کے علاوہ تنقیدی مضامین کے دو مجموعے ''موقف'' اور ''ارتکاز'' اور افسانوں کے دو مجموعے ''پلوٹو کی موت'' اور ''وہ دس اور دوسری کہانیاں'' شامل ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کے لیے ہندی سے ترجمہ کردہ ''منتخب دلتِ کہاں'' امیت چودھری کے انگریزی ناول کا ترجمہ ''ایک نئی دنیا''، نیز نیاز فتح پوری کا مونوگراف اور نیشنل بُک ٹرسٹ کے لیے ترجمہ کردہ سُبھاش چندر بوس کی سوانح حیات کے علاوہ نفسیاتی کتاب ''خوابوں کے اسرار'' نمایاں کتابوں میں شامل ہیں۔ رابندر ناتھ کی حیات اور کارناموں پر لکھی تحقیق ''تھوڑا اساٹیگور'' اور 94 عالی شان نظموں کا ترجمہ کردہ مجموعہ ''منعکس'' کے علاوہ تین سو نظموں کا ترجمہ ''پتلی برف'' بھی اُن کی بہت اہم کتابیں ہیں۔ ''یوروپ کا سفرنامہ''، ''سیریا میں دس روز'' اور ''چین یاترا'' تین مکمل سفرنامے ہیں۔

ف۔س۔اعجاز مغربی بنگال سے شائع ہونے والے سب سے مقتدر ادبی وثقافتی رسالے ماہ نامہ ''انشاء'' کے مالک اور ایڈیٹر ہیں جو اس وقت اپنی اشاعت کے 39ویں برس میں ہے۔ اب تک اِس کے 28 خاص شمارے شائع کر چکے ہیں۔

ف۔س۔اعجاز نے بڑی تعداد میں، انگریزی اور ہندی سے اُردو میں کئی کتابوں کے علاوہ افسانوں، مضامین اور شاعری کے ترجمے کئے ہیں اور اُن کی خود کے لکھے مختلف نظموں اور افسانوں کے ترجمے بھی ہندی، انگریزی، مراٹھی اور بنگلہ میں ہوئے ہیں۔ ''سیریا میں دس روز'' (سفرنامہ شام) کا ہندی میں ترجمہ حسن جمال نے ''شیش'' میگزین میں شائع کیا۔

''جہاں الفاظ جگنو ہیں'' اعجاز صاحب کی تصنیف کردہ 116 نظموں کا مجموعہ ہے جس میں چند رباعیاں اور ثلاثی چھوڑ کر باقی تمام آزاد اور پابند نظمیں ہیں۔ کتاب کا نام ہی قاری کو پہلی نظر میں جس طرح چونکا دیتا ہے۔ اُسی طرح کتاب میں نظموں کے عنوان موضوعات بھی نئے اور اچھوتے ہیں۔ کتاب کا عنوان اِسی نام کی ایک نظم سے ماخوذ ہے۔ شعر کی تخلیق کے وقت ذہن کے پردے پر ابھرنے والا خیال لفظ کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اُس میں اگر سوزش ہو تو وہ شرر بن کر فضا میں جگنو کی طرح رقص کرتا اور ماحول کو گرمیٔ فکر سے خوش گوار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اعجاز صاحب کے قلم کا یہ کمال ہے کہ آزاد نظم کو جسے عام لوگ بے مزہ کہتے ہیں، اُس میں استعاراتی رنگوں سے دل کش اور دھنک رنگ بنا دیتے ہیں۔ مجموعے کی تمام نظمیں موضوعات، اسلوب اور طرز ادا سے اپنا جواب آپ ہیں۔ بہت سی باتیں جنہیں طویل نظم میں بھی بیان کرنا دشوار ہوتا ہے، اعجاز صاحب اختصار میں بہت آسانی سے کہتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ آپ کی نظموں کو پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے کہ کوئی پہاڑی جھرنا اپنی لے میں گنگناتا ہوا اپنی منزل خود طے کرتا ہوا اور تشنگانِ علم و ادب کو سیراب کرتا ہوا اپنی دُھن میں بہہ رہا ہے۔ آپ کی ہمہ جہت تخلیقات اور اُس کے معیار و وقار کے مدنظر وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ فی زمانہ ملک کے منظر نامے پر اُردو شعر و ادب اور صحافت کے حوالے سے صفِ اول کے شعراء اور ادیبوں میں آپ کا ایک منفرد مقام ہے۔

مرزا غالب نے کہا کہ

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگ نائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لیے

اعجاز صاحب کا طائرِ فکر و نظر پابند شعری اصناف کی قید و بند ''تنگ نامے'' سے آزاد ہو کر کھلی فضا میں پرواز کرتا ہوا نظر آتا ہے تو اُسے وسیع و عریض دُنیا کے نظارے سے وہ موضوعات نظر آتے ہیں جو سطح پر چلنے والے کو نہیں دکھتے''۔ سب میرے جنازے تھے، پُلوٹو بنام پُلوٹو، اُسامہ مصلحت سمجھو، بزدل کس کے لیے تھا، کلکتہ ایک مِس کیریج، بسنت، جھوٹا دعویٰ، سات کوّا نظمیں وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو صرف آزاد نظم کے فریم ہی میں جڑی جاسکتی ہیں اور جڑنے والا ف۔ س۔ اعجاز ہو تو وہ کسی میوزیم میں نایاب آرٹ پیس میں رکھی جاسکتی ہیں۔ اعجاز صاحب کا زاویہ نگاہ اور طرزِ سخن اپنے ہم عصر قلم کاروں سے اِس لیے جُدا ہے کہ وہ جہاں گرد ہیں۔ ایشیا اور یورپ کے چند ممالک کی خاک چھان کر اُس سے برآمد ہیرے موتی سے اپنے کلام کی مرصع سازی کرتے ہیں۔ عالمی سطح کے ساتھ مسائل اور سماجی حالات پر آپ کی گہری نظر ہے۔ آپ کی نظمیں معاشرے کی خیر سگالی کا پیغام بھی دیتی ہیں۔

آزاد نظم کو اکثر قدامت پسند حضرات ناپسندیدہ نظر سے دیکھتے ہیں، شاید اِس لیے کہ یہ یورپ سے درآمد کردہ صنف ہے اور اِس لیے بھی کہ غزل کی طرح غنائیت، معنویت خیزی اور دوسرے اوصاف اِس میں نہیں پائے جاتے جو اچھی شاعری کی روح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غزل گوئی جتنی آسان ہے، آزاد نظم اُتنی ہی دقت طلب ہے۔ غزل قافیہ اور ردیف کی بیساکھی کے سہارے چلتی ہے جب کہ آزاد نظم شاعر کے خیال و فکر اور تخلیقی توانائی سے وجود میں آتی ہے۔ اعجاز صاحب نے اپنی آزاد نظموں سے ثابت کر دیا ہے کہ یہ غزل کے مصرعہ طرح کی پٹریوں پر نہیں چلتی، یہ آزادانہ اپنا راستہ خود بناتی ہے اور یہ بھی کہ اسے تشبیہات، استعارات وغیرہ سے بامعنی اور دل کش بنایا جاسکتا ہے۔

اِس مجموعے میں کچھ معنی خیز جدت طلب نظمیں بھی ہیں۔ کوّا ایک عام پرندہ ہے۔ قرآن مجید میں اِس کی عقل مندی کا ذکر آیا ہے۔ ہندوستان میں اسے کئی خوبیوں کے لیے جانا جاتا ہے۔ کوّے کو یم راج کا دوت مانا جاتا ہے۔ فوت شدہ لوگوں کے گناہ معافی کے لیے شرادھ کا کھانا کوؤں کو کھلانا باعث ثواب مانا جاتا ہے۔ اِس پرندے کو ادب میں جگہ دینے کا خیال اعجاز صاحب کو ہی آیا۔

اُردو شعراء آج تک بلبل، طوطا، مینا، کبوتر اور شاہین کو ہی استعارہ بناتے رہے ہیں جب کہ یہ سب فارسی شاعری سے اُردو میں مستعار ہیں۔ اعجاز صاحب نے اُردو شاعری کو ایک نیا ہندوستانی استعارہ دیا ہے اور اُس کو عام کرنے کے لیے اپنے ماہنامہ جریدے ''انشاء'' کا ایک خصوصی نمبر ''کوّا شمارہ'' بھی شائع کیا ہے۔ یہاں یہ کہنا بھی مناسب ہوگا کہ غزل کوّے کے استعارے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ یہ وصف آزاد نظم کو ہی حاصل ہے۔ اِس طرح اعجاز صاحب نے آزاد نظم میں ہندوستانی استعاروں کی شمولیت کی راہ ہموار کی ہے۔

ایک نظم جس کا عنوان ''سب میرے جنازے تھے'' ملک میں مسلم اقلیتوں پر مظالم کی علامتی تاریخ ہے۔ 16 اشعار کی مختصر نظم میں گذشتہ ایک صدی میں مسلمانوں پر جبر، تشدد اور اُن کے خونِ تاریخ کو ایک کوزے میں بھر دیا ہے۔ چند اشعار میں مسلمانوں کے قتل و خون کی منظر نگاری، درد کا اظہار، خدا سے شکوہ، دشمن کے لیے بد دُعا اور پھر مظالم کے ردِ عمل کے طور پر یہ عزم کہ ''اب مجھ کو بھی ہتھیار اُٹھانا ہی پڑے گا'' اور پھر خدا سے یہ سوال کہ ہتھیار اٹھانے کے سوا ''تدبیر کوئی ہو تو مجھ کو بتا دے'' کیوں کہ ہمیشہ میں ہی مارا جاتا ہوں اور ''اِس بار بھی میں دفن ہوا، میں ہی مرا ہوں'' یہ ایک مختصر مگر شاہکار نظم ہے اور آزاد نظم کو وقار اور معیار بخشتی ہے۔

کتاب میں چند ثلاثی (سہ مصرعی نظمیں) بھی شامل ہیں۔ ثلاثی اُردو کی قدیم ترین ایک صنف ہے۔ حضرت بندہ نواز گیسو دراز، گل برگہ (1422-1320ء) ثلاثی گو پہلے شاعر ہیں۔ اُس کے بعد ہر دور میں اکثر شعراء نے ثلاثی کہے ہیں مگر بحیثیت ایک صنف اُس کی شناخت نہیں قائم ہوسکی۔ راقم الحروف نے اسے شناخت دینے کے مقصد سے رباعی کی ''فاعلاتن مفاعلن فعلن'' کے اوزان پر قریب دو ہزار ثلاثی کہے جو تین مجموعوں میں شامل ہیں۔ رباعی کی پہچان اُس کے مخصوص اوزان سے ہونی چاہئے۔

میں نے تمام ثلاثی مذکورہ بالا اوزان میں جو کہے ہیں اُس کا پہلا اور تیسرا مصرعہ ہم قافیہ ہم ردیف اور درمیانی مصرعہ آزاد ہوتا ہے۔ اعجاز صاحب نے جو ''سہ مصرعی نظموں'' کے عنوان سے ثلاثی کہے ہیں وہ سب (22) مذکورہ بالا اوزان ہی میں لیکن آپ کے جدت پسند مزاج نے اُسے بھی قافیہ ردیف سے آزاد کر کے ایک نئی راہ نکالی ہے۔ اِس کے علاوہ نفسِ مضمون میں جدت طرازی کی ہے اور تین مصرعوں (ثلاثی) کے جادو کا بھی اعتراف کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

تین مصرعوں میں ایسا جادو ہے
پانچ دس بیس میں نہیں ہوگا
وہ جو خوش ہو تو چوم لوں اُس کو

تعریف نہیں، حقیقت ہے کہ اعجاز صاحب کے 22 ثلاثی اِس صنف کے پانچ ستارہ ادب پارے ہیں۔ اِن میں اعجاز صاحب نے حسن و عشق کے معاملات کے اظہار و بیان کو نئی سمت دکھائی ہے جس میں تکلف برطرف والی زندہ دلی کی جدید، مابعد جدید اور کلاسیکل شاعری کا ایک ایسا محلول پیش کیا ہے کہ اُس کے کھٹے میٹھے ذائقہ سے قاری کے منہ میں پانی آجاتا ہے۔

اعجاز صاحب نے اِس قدیم کلاسیکل صنف کو آزادی بھی عطا کی ہے اور اظہار و بیان کا نیا انداز بھی۔

میری درخواست ہے کہ اعجاز صاحب سب کام چھوڑ کر اِس صنف کو ''جدید ثلاثی'' کے نام سے ایک مجموعہ تیار کریں میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ مجموعہ اُردو میں ایک اضافہ بھی ہوگا اور وہ اُردو شاعری کی تاریخ میں اُن کو دوام بھی بخشے گا۔ اس کتاب کی سبھی نظمیں دل و دماغ کو متاثر کر کے قلم کو متحرک ہونے کا سگنل بھیجتی ہیں لیکن ایک مضمون کے فریم میں اُن کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔

❑❑❑

منظور پروانہ

دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

9452482159

تجزیہ

''اسرار احمد حیات و خدمات'' ڈاکٹر محمد اطہر مسعود کا لائق ستائش کارنامہ

''دنیا میں ان ہی لوگوں کو عزت اور عظمت حاصل ہوئی ہے جنھوں نے اپنے استادوں کا احترام کیا ہے۔'' سرسید احمد خاں کا یہ مقولہ نوک قلم پر آنے کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت میرے پیش نظر ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں کی مرتب کردہ تازہ کتاب ''اسرار احمد حیات و خدمات'' ہے۔ ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں کو جو عزت خداوند قدوس نے عطا فرمائی ہے۔ وہ شاید اسی لئے ہے کہ انھوں نے اپنے استادوں کا نہ صرف احترام کیا ہے بلکہ ان کی حیات اور جہات سے دوسروں کو روشناس بھی کرایا ہے۔ میرے پیشِ نظر جو کتاب اس وقت ہے اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں نے اپنے استاد ڈاکٹر حسن احمد نظامی کی حیات و خدمات پر ایک کتاب ترتیب دی تھی اور اپنے دوسرے استاد پروفیسر آفتاب شمسی کی کلیات کو بھی مرتب کیا۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہیں۔

ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں کا شمار ایسے قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ قلم و قرطاس کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف تنقید و تحقیق کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے، بلکہ انھوں نے انشائیہ نگاری، افسانہ نگاری کے ساتھ ادب اطفال کے میدان میں بھی کار ہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ اشاریہ سازی میں ان کی اپنی الگ شناخت ہے۔ ترتیب کے میدان میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ ''اسرار احمد حیات و خدمات'' بھی ان کی ترتیبی مہارت کا نمونہ ہے۔ کسی شخصیت پر کتاب ترتیب دینا ایک صبر آزما اور مشکل کام ہے۔ مگر اس کام کو ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں نے بخوبی انجام دیا ہے۔

''اسرار احمد حیات و خدمات'' دراصل ایک ایسی شخصیت کی خدمات کا اعتراف نامہ ہے جو صرف ایک استاد نہ تھے۔ بلکہ اسلاف کی صالح روایات کے امین، متحرک، اصول پسند، ایماندار، دوسروں خاص طور پر طلبہ کی مدد کے لئے ہمہ وقت تیار، دوسروں کے لئے دل میں ہمدردی رکھنے والے، باعمل اور اردو کی ترویج و ترقی کے ساتھ قوم کی فلاح کی فکر رکھنے والے انسان ہیں۔

''کتاب کو زیادہ مؤثر، کارآمد، یادگار دستاویزی اور مفید بنانے کے لئے یہ خیال کیا گیا کہ کیوں نہ اسرار صاحب کے لکھے ہوئے مضامین کو بھی اس کتاب میں شامل کر لیا جائے تاکہ یہ محفوظ ہو جائیں اور لوگ مستفید بھی ہوں۔ کتاب کے بالکل آخر میں، میں نے ایک کتاب کے اقتباسات پیش کئے ہیں یہ بہت اہم کتاب ہے اس میں ان بزرگوں کے واقعات درج ہیں جنھوں نے اپنے استادوں کی عزت و تکریم کی اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو رہتی دنیا تک کے لئے عزت و اعزاز سے سرفراز فرمایا۔ ہم نے صرف قلم کاروں سے ہی اسرار صاحب سے متعلق مضامین نہیں لکھوائے ہیں بلکہ اپنے تحقیقی مزاج کے مطابق، اسرار صاحب کی جو تحریر جہاں سے بھی دستیاب ہوئی اس کو حاصل کر کے کتاب میں شامل کر لیا ہے۔ کتاب کے مرتب ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں نے اپنے مقدمہ میں اسرار احمد کی طرز نگارش کے حوالے سے مندرجہ ذیل باتیں تحریر کی ہیں۔''

کتاب کا آغاز عام روایت کے مطابق ''انتساب'' سے ہوا ہے۔ مرتب نے انتساب بھی اپنے اساتذہ کے نام کیا ہے۔ انتساب کی عبارت یوں ہے۔ ''استاد محترم جناب اسرار احمد/ اور ان قابل احترام اساتذہ کے نام/ جو اپنے اعلیٰ و ارفع اخلاق/ اپنی بہترین تعلیم و تربیت/ پاکیزہ اور اچھے کردار/ نفیس آداب و تہذیب/ اور ہمدردی و غم گساری سے/ اپنے شاگردوں کو/ ہیرے کی طرح تراشتے ہیں/ اور پھر/ یہ طلباء یہ بچے۔۔۔۔۔۔ بوڑھے ہو کر بھی/ اپنے شفیق استادوں کو نہیں بھول پاتے/ اور ہمیشہ ان کے نقشِ قدم پر/ چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' کتاب کا پری فیس جسٹس ناہید آرا مونس کا ہے جو انگریزی میں ہے۔ پری فیس کے بعد ڈاکٹر حسن احمد نظامی، سابق صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج رامپور کا مضمون ہے۔ جس کا عنوان ہے ''میر کاروانِ خلوص'' اس مضمون میں ڈاکٹر حسن احمد نظامی نے ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ایک اہم بات بھی تحریر کی ہے۔ وہ یہ کہ ''عام طور پر ہمارے یہاں یہ دستور ہے کہ کسی شخص کے کارناموں کو بروقت یاد نہیں کیا جاتا ہے اور جب ایک مدت مدید گذر جاتی ہے تو لوگ جاگتے ہیں پھر تلاش ہوتی ہے کہ صحیح اور سچی باتیں دریافت ہو جائیں۔ اس لیے محبانِ اسرار کا یہ قدم لائق ستائش، مستحق داد و تحسین ہے۔'' ڈاکٹر نظامی اپنے اسی مضمون میں اسرار احمد کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ''جو صفت اسرار صاحب کو ایک ہر دل عزیز اور محبوب شخصیت بناتی ہے وہ اردو، ہندی اور انگریزی میں بے تکان تقریر کر سکتے تھے۔ لیکن ان کی تقریر سیاسی رہنماؤں یا مذہبی حضرات کی طرح جوشیلی نہیں ہوتی۔ وہ نہایت دانشمندانہ انداز میں تقریر کرتے ہیں۔ لیکن ایسے پرلطف واقعات یا لطیفے اس میں شامل کر دیتے ہیں کہ ان کی تقریر ہر شخص کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔'' اسی مضمون میں وہ اسرار احمد کی ایک اور خوبی کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں کہ ''اسرار کثیر المطالعہ شخصیت ہیں۔ ہمیشہ کتابیں رسالے پڑھنے کے علاوہ آن لائن مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ذہن میں تازہ بہ تازہ اور نوع بہ نوع مضامین آتے رہتے ہیں۔''

''اظہارِ تشکر'' یہ عنوان ہے اسرار احمد سابق پرنسپل حامد انٹر کالج رام پور کا۔ اپنے اس مضمون میں انھوں نے اپنے شاگرد کے اس کارنامے کے سلسلے میں چند اہم باتیں تحریر کی ہیں جو درج ذیل ہیں۔ ان شاگردوں کی ہمہ وقت یہ کوشش رہی ہے کہ شاگردی کا حق کما حقہٗ ادا کرتے رہیں۔ ان میں ماشاء اللہ ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں نے اپنی محبت اور عقیدت کے مظاہرے میں بازی اس طرح ماری کہ ناچیز کے شاگردوں، دوستوں اور محبان کی آراء کو ایک دستاویزی شکل میں شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا۔۔۔۔۔۔ یقیناً یہ کام آسان نہیں تھا۔۔۔ بلکہ اس کی تکمیل کا تصور بھی محال لگتا ہے مگر۔۔۔۔ ہمت مرداں مدد خدا۔۔۔۔

بہر حال میں ان کا اور اس کار صبر آزما میں ان کے معاونین کا بے حد مشکور و ممنون ہوں کہ ناچیز کو اس عزت کا مستحق سمجھا اور دعا گو ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی ان تمام کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو صحت و سلامتی عطا فرمائے، آمین!!!

نیز یہ کہ ان تمامی خواتین و حضرات، بہنوں اور بیٹیوں کا بھی تہہ دل سے مشکور ہوں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر میرے بارے میں اظہار خیال فرمایا۔''اظہار تشکر'' کے بعد کتاب کے مرتب ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں کا ''مقدمہ'' سامنے آتا ہے۔ یہ ''مقدمہ'' ۳۶ صفحات کو محیط ہے۔ اپنے اس طویل مقدمہ میں مرتب نے اسرار احمد کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ان کی خدمات کا بھی تفصیل سے ذکر خیر کرتے ہوتے ہوئے دوسری اہم باتوں پر بھی گفتگو کی ہے۔ آئیے مقدمہ پر بات کی جائے۔ مرتب نے مقدمہ میں سب سے پہلے اسرار احمد کی قلمی تصویر اس طرح پیش کی ہے۔ یہ اسرار صاحب ہیں۔ اپنوں میں ''پھول میاں'' کے نام سے مشہور!

گول چہرہ، گندمی رنگت، سیاہ اور سرمگیں آنکھیں، دراز پیشانی، اچھی قسمت اور سربلندی کی نشانی، ہلکے گھنگھریالے بال، دائیں پیشانی کو چومتی ایک شریر اور الھڑ سی بالوں کی لٹ، چوڑا سینہ، کشادہ کاندھے جو ذمہ داری کا بار اٹھانے کو تیار۔

اس قلمی تصویر کے بعد کچھ اور باتیں:

باتوں میں بات نکالنے کی ہنرمندی، بالمشافہ تو کیا موبائل پر بھی سلام میں پہل کرنے کی عادت۔ یہ ہنر کم ہی لوگوں کو آتا ہے کہ ان سے ملنے والا ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ بس میں ہی سب سے زیادہ عزیز ہوں، سب سے زیادہ چہیتا اور دل کے قریب ہوں۔

اگر ٹیچر یا استاد نہ ہوتے تو سو فی صد بہترین قلم کار ہوتے، قلم کاری کی ساری خوبیاں بدرجۂ اتم موجود، اسلوب نہایت سادہ اور دلنشیں، ماشاء اللہ!

اپنے استاد اسرار احمد کی باتیں کرتے کرتے ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں ماضی کی یادوں میں کھو جاتے ہیں اور بقول ان کے ''اب دماغ کے کینوس پر اسکول کی فلم چلنے لگی ہے'' اس فلم کے کردار میں وہ اساتذہ جنھوں نے ان کو پڑھایا ہے۔ ان کے نام ہیں۔ پشوپتی ناتھ جی، لطیف احمد خاں صاحب، اکبر خاں صاحب، آغا صاحب، دلدار آغا صاحب، انصاری صاحب، صداقت خاں صاحب، رتن لال جی اور سدا ماجی۔ ان اساتذہ کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ اس زمانے کے ماحول کو یاد کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ ''کیسے دن تھے، کیسے لوگ تھے، نہ ہندو نہ مسلمان، نہ ذات نہ برادری، ہندو مسلم سب کے تہواروں کی برابر چھٹیاں ہوتیں۔''

اساتذہ کرام کے ذکر خیر کے بعد مرتب نے ''حامد اسکول'' کا تعارف کراتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ''حامد اسکول فن تعمیر کا ایک بہترین شاہکار ہے اور مغربی طرز تعمیر کا خاص طور سے برطانیہ کی عمارات کی جھلک اس میں ملتی ہے۔ حامد اسکول اس لحاظ سے بھی ایک تاریخی اسکول ہے کہ اس میں مولانا محمد علی جوہر نے بھی ابتدائی تعلیم حاصل کی ہے۔''

مندرجہ بالا اطلاعات فراہمی کے بعد مرتب نے ''اسرار احمد حیات و خدمات'' کی ترتیب کے حوالے سے بہت سی معلومات تحریر کی ہیں۔ چند اہم معلومات درج ذیل ہیں۔

ہم نے پیش نظر کتاب کو کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ابتدائی صفحات میں انتساب، نظامی صاحب اور اسرار صاحب کے مضامین، مقدمہ اس کے بعد اسرار صاحب اور اپنے ادبی و سوانحی تعارف کو جگہ دی ہے۔ اس کے بعد مضامین کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ یہ مضامین مختلف قلم کاروں کے ہیں۔ ان مضامین کو قلم کاروں کے ناموں کے حروف تہجی ترتیب کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ ان مضامین میں جونیئر، سینئر، استاد شاگرد اور خواتین و حضرات قلم کاروں کی کوئی تخصیص نہیں رکھی گئی ہے۔ یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ جن مضامین کے ساتھ تاریخ درج ہے ان میں ہر مضمون کی تاریخ تحریر بھی آخر میں درج کر دی گئی ہے۔

مضامین کے بعد اسرار احمد صاحب کے تعلق سے جو نظمیں موصول ہوئی ہیں ان کو بھی اسی ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہم نے زینب سہیل خاں کا لیا انٹرویو بھی کتاب میں شامل کیا ہے۔ یہ انٹرویو ہم نے فرمائشی طور پر زینب سے تیار کرایا ہے۔

آپ کے تحریر کردہ ایک سہرے کی تضمین بھی کتاب کی رونق بڑھا رہی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سہرے کی یہ تضمین ۱۹۶۴ء کی ہے جس کی اشاعت کا موقع ہمیں اب ملا۔

کتاب کو زیادہ مؤثر، کارآمد، یادگار دستاویزی اور مفید بنانے کے لئے یہ خیال کیا گیا کہ کیوں نہ اسرار صاحب کے لکھے ہوئے مضامین کو بھی اس کتاب میں شامل کر لیا جائے تاکہ یہ محفوظ ہو جائیں اور لوگ مستفید بھی ہوں۔ کتاب کے بالکل آخر میں، میں نے ایک کتاب کے اقتباسات پیش کئے ہیں یہ بہت اہم کتاب ہے اس میں ان بزرگوں کے واقعات درج ہیں جنھوں نے اپنے استادوں کی عزت و تکریم کی اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو رہتی دنیا تک کے لئے عزت و اعزاز سے سرفراز فرمایا۔ ہم نے صرف قلم کاروں سے ہی اسرار صاحب سے متعلق مضامین نہیں لکھوائے ہیں بلکہ اپنے تحقیقی مزاج کے مطابق، اسرار صاحب کی جو تحریر جہاں سے بھی دستیاب ہوئی اس کو حاصل کر کے کتاب میں شامل کر لیا ہے۔ کتاب کے مرتب ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں نے اپنے مقدمہ میں اسرار احمد کی طرز نگارش کے حوالے سے مندرجہ ذیل باتیں تحریر کی ہیں۔ تحقیقی اور تنقیدی مضامین میں جہاں دماغ کی کارفرمائی سب سے زیادہ ہوتی ہے وہیں تخلیقی عمل میں دل کی باتیں (من کی نہیں) اور جذبات کا اظہار لازمی قرار پاتا ہے۔ اسرار صاحب کی تحریروں میں تخلیقی عناصر غالب رہتے ہیں ان میں جذبات نگاری بھی شامل رہتی ہے۔

ان کے یہاں سائنس کے ساتھ اردو ادب کی تہذیبی قدروں اور اس کی چاشنی کا بڑا دلکش میل نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب وہ سائنسی مضامین لکھتے ہیں تو ان میں بھی زبان و بیان کا وہ رنگ نمایاں ہوتا ہے جو صرف اردو جاننے والوں کے ہی سمجھنے کی چیز ہوتا ہے۔

اپنے مقدمہ میں ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں نے اسرار احمد کے ایک افسانے اور ۱۳ر مضامین پر اپنی رائے پیش کی ہے۔ جس میں مضمون کی اہمیت و افادیت، اس میں دئے گئے پیغام وغیرہ پر بات کی ہے۔ اس کے بعد مرتب نے کتاب کی ترتیب میں پیش آنے والی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ تحریر کیا ہے کہ ''اس کتاب کی ترتیب کا کام ہم نے ۲۰۰۶ء میں شروع کیا تھا لیکن ایک صاحب کے بھانجی مارنے کے سبب یہ کام رک گیا۔ (بھانجی مارنا رامپور کا ایک محاورہ ہے اس کا مطلب ہے کہ کسی کام میں ایسی رکاوٹ ڈالنا کہ وہ کام انجام تک نہ پہونچ سکے۔ بھانجی کا صحیح تلفظ بھاں جی ہے)

اپنے اس مقدمہ میں ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں نے اصل موضوع سے ہٹ کر بھی کچھ باتیں تحریر کی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک اقتباس پیش ہے۔ ان کو یہ شکایت ہے کہ ''ہندوستان کے مختلف ادبی اداروں، ناشرین اور اردو رسائل نے اردو نمبروں (۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰) کو تج کر

ادب سے خارج کر دیا ہے اور اس طرف اب لوگ توجہ بھی نہیں دے رہے ہیں۔ میں نے اب تک کوئی ایسا مضمون نہیں پڑھا جس میں اس بابت اشارہ کیا گیا ہو کہ اردو زبان کے ان نمبروں کو بھی باقی رکھا جائے۔"

آخر میں مرتب نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ "مثل ہے کہ کبھی نقش اول سے نقش ثانی بہتر ہوتا ہے اس لئے اس کتاب کی اشاعت کے بعد بھی ان شاءاللہ اور بہت سے لوگ قلم اٹھائیں گے اور کچھ تبصرے بھی یقینا منظر عام پر آئیں گے۔ امید ہے کہ ان سب کو یکجا کر کے ہم اس کتاب کا دوسرا اور اضافہ شدہ ایڈیشن اگلے سال لے کر آئیں گے، ان شاءاللہ تعالیٰ!"

"مقدمہ" کے مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں امید ہے کہ قارئین کو کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ بخوبی ہو گیا ہوگا۔ اسی کے ساتھ اس بات کا بھی علم ہو گیا ہوگا کہ کتاب میں کیا کچھ ہے۔ مگر۔۔۔۔۔۔ حقیقتاً یہ سب کتاب کے مرتب کے خیالات ہیں۔ اس لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں شامل ۷۴ رمضامین جو اردو، ہندی، انگریزی میں ہیں ان میں سے اردو کے مضامین سے کچھ اقتباسات نذر قارئین کر دئے جائیں تاکہ اس کی روشنی میں قارئین کو اسرار احمد کی حیات کے تمام پہلوؤں سے آگاہی ہو جائے۔

ان کا گھر، ان کی صحبت، انداز گفتگو میرے نزدیک ایک درس گاہ ہے۔ جہاں بیٹھو تو خالی الذہن مگر اٹھو تو بہت کچھ سیکھ کر۔ کہتے ہیں "ایک اچھی کتاب سو دوستوں سے بہتر ہے اور ایک کامل استاد ہزار کتابوں سے بڑھ کر ہے۔" (ڈاکٹر ارم نعیم)

☆ آج استاد کی حیثیت ایک گرو کی نہیں، ایک آلۂ تعلیم کی رہ گئی ہے۔ یہ صورت حال بڑی تشویشناک ہے۔ آج سماجی سطح پر ایک انقلاب کی ضرورت ہے جس سے انسانی اور اخلاقی قدروں کی گراوٹ کو روکا جا سکے۔ (اسلم حسن خاں)

اسرار صاحب رامپور کی تہذیب و تمدن کی شناخت ہیں۔ زندگی کی بہترین قدروں کے امین ہیں۔ میرے نزدیک ان کی شخصیت اس تناور اور چھتنار درخت کی طرح ہے جس کی جڑیں زمین کے اندر دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آپ کی سادگی، حلم و انکساری، بردباری اور علم دوستی کا میں ہی کیا یہ تمام شہر قائل ہے۔ (ڈاکٹر الف۔ ناظم)

شادی کے بعد انھوں نے جو پہلی فرمائش مجھ سے کی وہ یہ تھی کہ چاہے میں کتنا ہی تھکا ہارا سو رہا ہوں اگر کوئی مجھ سے ملنے آئے تو میری تھکن کا خیال نہ کرنا اور فوراً جگا دینا، نہ معلوم وہ کس ضرورت سے آیا ہو۔ اور یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ (ڈاکٹر پروین اسرار)

آپ سائنس کے طالب علم اور سائنس کے استاد رہے لیکن اردو پر پکڑ اتنی زبردست کہ اردو والے پانی بھریں۔ اقبال، غالب اور دیگر شعراء کے متعدد اشعار ازبر اور کتنے مقولے زبان زد (ڈاکٹر رباب انجم)

میں نے ان سے محض ریاض اور سائنسی علوم ہی نہیں سیکھے بلکہ حسن اخلاق اور انسانیت کا درس بھی لیا۔ آپ کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ جب بھی کسی طالب علم کو ان کے سمجھانے کے باوجود کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو وہ دوسرے بچوں کو چھوڑ کر سب سے پہلے اپنے اس شاگرد سے اس کے مسائل معلوم کرتے اور نہایت شفقت سے کئی کئی بار اس کو ذہن نشین کراتے، جب تک اس کی سمجھ میں نہیں آتا اور خود بھی اس سے مطمئن نہیں ہو جاتے اس کی ہر طرح مدد کرتے رہتے۔ (رضوان لطیف خاں)

ماسٹر اسرار صاحب صرف فن گفتگو کے ہی ماہر نہیں بلکہ ان کے الفاظ جب تحریر میں بولتے ہیں تو اسلوب کی جادوگری سے ایک دلکش سماں باندھ دیتے ہیں آپ کا مطالعہ بے حد وسیع اور شعری ذوق نہایت اعلیٰ و پختہ ہے نیز زبان و بیان کی باریکیوں سے خوب واقف ہیں۔ (ڈاکٹر زرنگار)

اسرار صاحب کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے تقریباً اٹھارہ سال ہو چکے ہیں لیکن وہ آج بھی اپنی ادبی و علمی ذمہ داریاں اپنا فرض سمجھ کر نبھا رہے ہیں۔ ہاں کبھی کبھار ان کی بچیوں کی محبت دل کو تڑپاتی ہے، طبیعت بے قرار اور بے چین ہو جاتی ہے، وقت تجویز کرتے ہیں اور دہلی یا لندن کے سفر پر نکل جاتے ہیں۔ (سعید ریاض)

وہ صحیح معنوں میں ایک انسان، انسانیت دوست، خدا ترس، دوستوں کے دوست، یاروں کے یار ہیں۔ وہ دوستوں کا حق بطور قرض اور قرض ادا کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ وہ ایک آدمی ہی کی طرح نظر آتے ہیں مگر ان کے ظاہری و باطنی محاسن کا احاطہ کرنا مجھ جیسے بے بضاعت کے بس کی بات نہیں۔ (ڈاکٹر شریف احمد قریشی)

حالیہ برسوں میں جوہر یونیورسٹی کا قیام بھی ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ تعلیمی اعتبار سے ماضی کا حال سے موازنہ کریں تو بے اطمینانی محسوس ہوتی ہے کہ اب ماسٹر اسرار احمد صاحب جیسے ایماندار، دردمند اور مشفق اساتذہ کم ہوتے جا رہے ہیں۔ استاد اور شاگرد کا رشتہ کمزور پڑ رہا ہے۔ (طالب رامپور)

انھوں نے تسخیر قلوب سے اصلاح قلب کا کام لیتے ہوئے تجلیوں کا تجزیہ کر ایسے ادبی چراغ روشن کئے ہیں جو وقت کی آوارہ آندھیوں، گھنگھور گھٹاؤں، بے رحم زلزلوں اور دہکتے چنگھاڑتے آتش دانوں سے بھی ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔ (ظفر سکھ نین)

دس منٹ کی ایک ریڈیو ٹاک کے لئے اس قدر محنت، اتنی دیوانگی کہ جس سے اس موضوع کا حق ادا ہو جائے۔ یہ میں نے صرف اور صرف اسرار احمد صاحب کے پاس ہی دیکھی۔ (پروفیسر غیاث الرحمن سید)

سائنس کے متعلق معلومات جمع کرنا اور تمام نئی نئی معلومات سے اپ ڈیٹ رہنا آپ کا بہترین مشغلہ ہے۔ دوران تعلیم آپ کھیلوں اور ثقافتی پروگراموں سے بھی جڑے رہے آپ نے بیت بازی، تمثیلی مشاعرے اور کئی ڈرامے بھی اسٹیج کئے۔ (فائزہ زبیر شمسی)

اسرار صاحب ایک مصنف بھی ہیں آپ اب تک بہت سے مضامین لکھ چکے ہیں۔ ریڈیو ٹاک کے لئے بھی آپ نے مختصر تقاریر لکھیں جو رام پور اور لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئیں۔ اسرار صاحب نے لڑکیوں کی تعلیم کی طرف بھی خصوصی توجہ دی۔ (ڈاکٹر گلناز صدیقی)

محترم اسرار صاحب کے کردار کا ایک اور وصف، جو ان کو بہت سی شخصیات سے بلند و بالا کرتا ہے۔ ان کا صوم صلوٰۃ کا پابند ہونا ہے۔ نماز دین کا ستون ہے اور اسرار صاحب موصوف نے ہمیشہ اس ستون کو قائم رکھا ہے۔ انھوں نے دین کے ستون کو کبھی منہدم نہیں ہونے دیا۔ زندگی میں کتنے نشیب و فراز آئے، کتنے ہی لا دینی ماحول سے دو چار ہوئے مگر ترک صلوٰۃ نہیں کیا۔ آج کی جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ اکثر شخصیات اس میدان عمل میں کمزور نظر آتی ہیں۔ استاد محترم میں یہ وصف میں نے بچپن سے آج تک ایسا ہی پایا (مکارم الحق مکارمی)

مندرجہ بالا اقتباسات سے قارئین کو اسرار احمد کی حیات و خدمات کے مختلف اور روشن گوشوں کی آگہی ہو گئی ہوگی۔ مگر ان مضامین کے بعد زینب سہیل خاں کا اسرار احمد سے لیا گیا انٹرویو سونے پر سہاگہ ہے۔ یہ انٹرویو ۸۳ سوالات پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ مرتب نے کتاب میں اسرار احمد کی ۳۸ رنثری و شعری تخلیقات کو شامل کر قارئین کو ان کی اصل تحریر کو پڑھنے اور اس سے مستفید ہونے کا موقع بھی فراہم کیا ہے۔ چونکہ یہ کتاب ایک استاد کی حیات و خدمات پر مبنی ہے اس لئے اس کتاب کے آخر میں ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں نے ایک کتاب کے اقتباسات کو پیش کیا ہے جس میں استادوں کی عزت و تکریم کے واقعات ہیں۔

مندرجہ بالا تمام معلومات اور پوری کتاب کے مطالعہ کے بعد مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ کتاب کے مرتب ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں نے مردہ پرستی کی روایت سے ہٹ کر "اسرار احمد حیات و خدمات" کو ترتیب دے کر ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ امید کی جانی چاہئے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے نئی نسل میں اساتذہ کے ادب و احترام کا جذبہ نہ صرف برقرار رہے گا بلکہ اس میں اضافہ ہوگا۔ یہی اس کتاب کی کامیابی ہے۔ جس کے لئے ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں ہماری تبریک کے مستحق ہیں۔

❑❑❑

غزل

میں زندگی میں کئی بازیوں کو ہارا ہوں
کبھی کبھی تو لگا ہے کہ بے سہارا ہوں

مجھے بجھانے کی جن آندھیوں نے سازش کی
انہیں پتا ہی نہیں تھا میں اک ستارا ہوں

تو اپنے سر پہ نہ تہمت لے توڑنے کی مجھے
ستم شعار ! میں پہلے سے پارہ پارہ ہوں

سیاہ فام ہوں صورت ہے ایسی ویسی مگر
میں اپنی ماں کی نگاہوں میں ماہ پارہ ہوں

ہمیشہ میں نے ہی خود کو تمہاری نذر کیا
کبھی تو تم بھی کہو مجھ سے میں تمہارا ہوں

پیامِ عہد وفا جس کے لفظ لفظ میں ہے
میں اس غزل کی علامت ہوں استعارہ ہوں

نہ جس میں ایک عدد کم نہ اک زیادہ ہے
میں زندگی کا شفیعؔ ایسا گوشوارہ ہوں

ڈاکٹر محمد شفیعؔ سیتاپوری
رفاقتی مسجد روڈ محلہ ہدایت نگر، لکھیم پور کھیری، یوپی
9453617800

غزل

زندگی کے مقصد کو کامیاب کردیں گے
جب سناں پہ ہم سر کو آفتاب کردیں گے

خارزار راہوں میں خون رِستے چھالوں سے
ہر قدم نیا برپا انقلاب کردیں گے

مسکرائیں گے جس دم تیر کھاکے مقتل میں
اپنے قاتلوں کو ہم آب آب کردیں گے

موت کو بدل دیں گے جس گھڑی شہادت میں
ہم تری محبت کو کامیاب کردیں گے

جب بہے گی آنکھوں سے اک فرات اشکوں کی
قاتلوں کی دنیا کو ہم عذاب کردیں گے

علم سے تمسک ہے باب علم سے رشتہ
پیش ہم سوالوں کے سب جواب کر دیں گے

وقت آنے دے جاناں، یہ ہمارا وعدہ ہے
پورے تیری آنکھوں کے سارے خواب کردیں گے

مجاور مرزا سانکھنوی
سانکھنی، بلندشہر
9568786110

غزل

جگر کا خون نچوڑا تو فن کو باندھا ہے
بڑے سلیقے سے میں نے سخن کو باندھا ہے

ترے ہی دم سے ہیں محفل کی رونقیں ہمدم
ترے فسوں نے، مری انجمن کو باندھا ہے

خزاں کا درد ستائے تجھے خدا نہ کرے
ترے لیے ہی بہارِ چمن کو باندھا ہے

میں پُل صراط سے گزرا بھی اور پتا نہ چلا
درود پڑھ کے جو اپنے بدن کو باندھا ہے

بہت نشہ ہے اسے اپنی حق پرستی کا
حیات چھوڑ کے دار و رسن کو باندھا ہے

اجل کا نام بھی سنتے ہیں زندگی ہے یہاں
جبھی تو سر سے ہمیشہ کفن کو باندھا ہے

کلیمؔ لعل و گہر سے یہ بیش قیمت ہیں
کہ مٹھیوں میں جو خاکِ وطن کو باندھا ہے

کلیم سہسرامی
میمونہ منزل، اولڈ عظیم آباد کالونی، پٹنہ
9504751737

غزل

کسی کا شوقِ ملاقات دیکھنے کے لیے
میں دن نکالتی ہوں رات دیکھنے کے لیے

چڑھا دیے ہیں دریچوں پہ مخملی پردے
وہ لوٹ آتا ہے حالات دیکھنے کے لیے

اسے کہو کہ ذرا وقت دیکھ کر آئے
شکستہ ذہن کے خدشات دیکھنے کے لیے

گزشتہ روز پرندوں نے ہجرتیں کرلیں
تمہارے شہر کے باغات دیکھنے کے لیے

وہ خشک حال مری زندگی میں آیا ہے
خزاں کے دور میں برسات دیکھنے کے لیے

مخالفوں نے لگائی ہیں منفرد آنکھیں
مری گھسی پٹی اوقات دیکھنے کے لیے

مرے سراغ رساں چینلوں سے جڑ جائیں
زمانے بھر کے فسادات دیکھنے کے لیے

شازیہ نیازی
عالم نگر، برنپور، آسنسول، بنگال
8250564231

غزل

رعنائیوں میں گم رہا اظہار نہیں
کل تک جومیرا یار تھا دل دار اب نہیں

ناز و نعم اُٹھائے صنم کو بہ کو سدا
دل کو نہیں قرار ہے، انکار اب نہیں

حسن و جمال میں تھا گرفتار کل تلک
کہدو صنم سے دل یہ گرفتار اب نہیں

شمس و قمر کے خوب‌رو دلبر تھا بالیقیں
امید پربہار تھا پر یار اب نہیں

صہبا نہیں، خمار نہیں، جام و خُم نہیں
توبہ کیا ہے دل سے، طلب‌گار اب نہیں

دیر و حرم سے واسطہ مجھ کو نہیں صنم
قلب و جگر میں جاگزیں اغیار اب نہیں

طالبؔ ترا سلوک بھی بہتر نہیں رہا
باعث تمہارے اپنے بھی غم‌خوار اب نہیں

ڈاکٹر طالبؔ اکرام
چھتے متو،مہروندا،متوآئما،پریاگ راج
7800812595

غزل

عشق تفصیل طلب تھا،اُسے سمجھا نہ گیا
مجھ سے اُس شخص کا یوں دیکھنا،دیکھا نہ گیا

تشنگی جائے گی موجوں کی طرف خود چل کر
پیاس کے سامنے چل کر کبھی دریا نہ گیا

اس نے بس ایک جھلک اپنی دکھائی تھی مجھے
عمر بھر دید کی حسرت لیے صدمہ نہ گیا

لطف جب آتا کہ ڈھل جاتی تری فکر میں ۔میں
تُجھ سے میرے لیے میری طرح سوچا نہ گیا

کچھ بچا ہوتا تو میں پیش تُجھے کر دیتی
کیا بتاؤں کہ ترے عشق میں کیا کیا نہ گیا

ان سے کہنا تو بہت کچھ تھا نہیں کہہ پائی
آ کے تنہائی میں خود پر میرا غصہ نہ گیا

دیکھ ہی لیتے نظر بھر کے مجھے وہ خوشبو
ان نگاہوں سے مجھے بزم میں پوچھا نہ گیا

خوشبو پروین
ریسرچ اسکالر یونی ورسٹی آف دہلی
7644096273

حبیب کیفی

لالہ لاجپت رائے کالونی، عیدگاہ چوپاسنی روڈ، جودھپور

8000245673

افسانہ

نابینا سرکار

”تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔“ سمجھائش کے انداز میں خاتون نے نثار کی طرف دیکھا۔”تم بس اتنا بتادو کہ کہاں چھوڑ آئے ہو اپنے ابا کو؟“

جواب میں نثار نے سر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا اور خاموش رہ گیا۔

دیر رات وہ جب لوٹا تھا تو نفیسہ کے ساتھ ہی خاتون بھی اس کا بڑی بے صبری اور بے چینی سے انتظار کر رہی تھی. لاکھ پوچھنے کے باوجود ایک لفظ بھی نہیں چھوٹا تھا اس کے منہ سے. اس وقت نشے کے سبب ڈولتا ہوا کسی طرح وہ چار پائی تک پہنچا اور دھڑام سے اس پر گر کر پسر گیا تھا. پھر اس کے بعد نیند نے چند ثانیوں میں ہی اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

اب جب کہ صبح ہوئے بڑی دیر ہو چکی تو خاتون کا پھر وہی ایک سوال اس کے آگے تھا کہ مولا بخش کہاں ہے۔ لیکن نثار کی طرف سے کوئی جواب نہیں تھا۔ کئی طرح سے اور کئی بار اس سے یہی سوال پوچھا گیا۔ پر وہ گھنا بنا رہا۔ اس کے منہ سے اس سلسلے کا ایک لفظ بھی نہیں چھوٹا۔ تب آخر تھک ہار کر وہ دونوں ہی ماں بیٹی ایک طرف بیٹھ رہیں۔ انہیں امید تھی کہ نثار کچھ تو بتائے گا۔ لیکن نثار کیا بتاتا؟ سلسلے وار اسے تو کچھ بھی یاد نہیں تھا. ذہن پر زور دینے پر اسے البتہ کچھ کچھ یاد ضرور آرہا تھا---- سہ پہر تھا۔ نشے کی حالت میں وہ گھر میں گھسا تھا۔۔۔۔ بے روزگاری کو لے کر عادت کے مطابق باپ نے لعن طعن کی تھی۔۔۔۔ معاملہ الجھ کر اس وقت کچھ زیادہ ہی بڑھا تو بڑھتا ہی گیا۔۔۔۔ آنکھوں کی روشنی سے محروم مولا بخش کے گریبان پر مضبوط گرفت رہی تو وہ بے بس ہو چلا۔۔۔۔ دوڑ کر نفیسہ نے باپ کو اس سے چھڑا لینا چاہا لیکن وہ ناکام رہی۔۔۔۔ پھر اس کے بعد یاد آیا کہ باپ کو زبردستی گھر سے لے کر وہ دور، بہت دور لے گیا تھا اور۔۔۔۔ کہاں چھوڑ آیا تھا اسے وہ؟ یاد ہی نہیں آرہا ہے۔ ذہن پر بار بار زور دینے پر بھی کچھ یاد نہیں کر پا رہا تھا وہ۔۔۔۔

ماں اور بہن کو فکر مند چھوڑ کر نثار گھر سے نکل آیا۔ اس دم اسے اصل میں نشے کی طلب ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے لیے رقم اس کے کھیسے میں ناکافی تھی۔ کیا کیا جائے؟ اسی فکر اور بے چینی کے عالم میں وہ بڑی دیر تک بھٹکتا ہوا دور نکل آیا۔ دھیان کیا تو اس نے پایا کہ شہر بڑی حد تک پیچھے چھوٹ چلا ہے اور یہاں دور دور بنے کچے پکے گھروں کے علاوہ جھونپڑیاں بھی ہیں۔ مصروف سڑک کے کنارے ایک طرف پیڑ کے نیچے دیکھا تو اسے مولا بخش نظر آگیا۔ اسے دیکھا تو وہ فوراً ہی اس کی طرف لhttpsپکا۔ نزدیک جا کر اس نے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہاں پیڑ کے سائے میں مولا بخش خاموش ایک طرف بیٹھا تھا اور اس کے آگے دس اور ابیس کے نوٹوں کے علاوہ بڑی تعداد میں چلر بھی ادھر ادھر پڑی تھی۔ ابھی وہ اس طرف بڑھتا کہ ایک بائیک سوار رکا اور دس کا نوٹ وہاں رکھ کر بائیک سمیت روانہ ہو گیا۔

نثار نے جب یہ سب دیکھا تو حیرانی کے ساتھ ہی ساتھ اسے بڑی مسرت بھی ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے انجینیرڈ دماغ میں اگلا پروگرام بھی بڑی سرعت کے ساتھ مرتب کر ڈالا۔ اپنے اس پروگرام کے مطابق ہی نثار نے مولا بخش کے کان میں پھونک مارنے کی صورت ایک ہی بات کہی کہ اسے اپنا منہ بند رکھنا ہے۔ منہ بند رکھنے کی ضمن میں مولا بخش کو بے ساختہ اپنی بند ہو چلی انکھوں کا خیال آگیا اور اس کے ساتھ ہی آسمان کی طرف منہ اٹھا کر وہ دل ہی دل میں کہہ اٹھا، مولا! پہلے آنکھیں بند ہوئیں اور اب منہ بھی بند رکھنے کی لیے کہا جا رہا ہے! اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنی اس حالت میں پہنچنے کی بات بھی یاد ہو آئی----

شیتل پرساد انڈسٹریز کے ڈھلائی سیکشن میں ماسٹر جی کے نام سے مشہور مولا بخش برسوں سے کام کر رہا تھا۔ اس دن بھی وہ بڑی تندہی کے ساتھ اپنے کام میں لگا تھا کہ اچانک ہی یہ دل دوز حادثہ پیش آگیا۔ جہنم کی آگ کی طرح بھڑکتی ہوئی بھٹی سے اچانک ہی نہ جانے کیا اچھلا کہ مولا بخش کا چہرہ جھلس کر رہ گیا۔ اسی سبب اسے کئی دنوں تک ہسپتال میں رہنا پڑا۔ بعد میں چہرے کی چمڑی تو بڑی حد تک ٹھیک ہو گئی لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود آنکھیں اس کی روشنی سے محروم ہو کر رہ گئیں۔

”شاہ راہ کے کنارے مولا بخش کے رہنے اور سونے کے مقام پر پہلے پہل دو تین لوگ بیٹھنے لگے اور پھر ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی خاص وجہ یہ رہی کہ مولا بخش بیمار اور پریشان حال لوگوں کی سن کر اپنے طور پر روحانی علاج کی صورت آیتیں پڑھ کر ان پر دم کرنے لگا تھا۔ اس کا خاصہ اثر بھی دیکھنے میں آرہا تھا۔ بعد میں دبی زبان میں وہاں ایک جنے نے مولا بخش سے ایک روز مٹکے کا نمبر جان لینا چاہا تو اسے سخت کوفت ہوئی اور جھلا کر غصے کی حالت میں الل ٹپو میں ہی اس نے ایک کوئی نمبر تھوک ہی دیا تھا جیسے۔ اب یہ اتفاق رہا یا قدرت کا کرشمہ کہ شام ہونے سے پہلے پہلے اسی نمبر کے سبب نمبر پوچھنے والے کی جیبیں خاصی وزنی ہو چلی تھیں۔ پھر کیا تھا، سلسلہ چل نکلا۔ بعد میں مولا بخش سے دم کرانے والوں سے کئی گنا زیادہ تو وہاں مٹکے کے نمبر معلوم کرنے والوں کی آمد و رفت ہو گئی۔“

مولا بخش کو تو اس سے آگے کی باتیں بھی یاد تھیں۔۔۔۔ پھر اس کے بعد شیتل پرساد انڈسٹریز میں اس کا جانا نہ ہو سکا۔ یہ عین فطری بھی تھا۔ تاہم سیٹھ نے مولا بخش کو نہیں بھلایا۔ اس حادثے کے بعد ایک دن وہ خود اس کے گھر گیا اور انسانیت کے تقاضے کے تحت اس کے ساتھ ہی اس کی بیوی خاتون اور بیٹی سے بھی اس نے بڑی ہمدردی جتائی۔ بعد میں وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے اس نے ایک بڑا سا لفافہ اسے تھما دیا تھا۔ مولا بخش نے جانا کہ لفافے میں بڑے کرنسی نوٹوں کی شکل میں ایک بڑی رقم تھی۔ اس رقم کی روشنی میں خاتون کا خیال رہا کہ مالی مشکلات بڑی حد تک دور ہو رہیں گی۔ اس اثنا میں ڈگری یافتہ نثار کسی نوکری سے لگ کر معقول کمائی کرنے لگے گا لیکن ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بھی خاتون کی یہ امید بر نہیں آئی۔ بلکہ اس کے برعکس ذہنی خلفشار اور مایوسی کے سبب نثار کسی طرح کے نشوں کا ہو رہا۔ یہی وجہ رہی کہ اس کے اخراجات میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوتا گیا۔ اب آگے کی صورتحال سامنے تو ہے۔ اس سے آگے مولا بخش اور کیا کیا یاد کرتا؟ سو اس نے اس طرف ذہن دوڑانا ہی بند کر دیا۔

باپ کے سبب نثار کی زندگی میں بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں آنے لگیں۔ سب سے پہلے تو اس نے خود پر کنٹرول کر کے نشے پر بھی کنٹرول کیا۔ اب وہ ہر وقت دھت رہنے کی جگہ محدود مقدار میں ہی نشہ آور اشیاء کا استعمال کرنے لگا تھا۔ اس سے اس کی صحت پر بھی مثبت اثر پڑا تھا۔ اچھا اثر تو ادھر معقول آمدنی کے سبب گھر میں خاتون اور نفیسہ پر بھی پڑنے لگا تھا۔ کھانا اب یہ لوگ دونوں ہی وقت دلپسند کھانے لگے تھے۔ اس کے علاوہ موسم کے مطابق پھل فروٹ بھی آنے لگے تھے۔ سوکھے میوے بھی۔ یہی وجہ رہی کہ صحت ان تینوں کی دنوں دن سدھرتی چلی گئی۔ نثار کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ کچھ ہی عرصے میں نئی نکور بائیک یوں ہی نہیں آ گئی ہے اور نہ ہی بھاری بھاری قرضوں سے آسانی کے ساتھ نجات ہی ملی ہے۔ اسی طرح کے تمام روشن پہلوؤں کی ایک اور صرف ایک ہی وجہ رہی ----والد محترم جناب مولا بخش صاحب!

والد کی طرف سے نثار نے لیکن کسی ایک دن بھی غفلت نہیں برتی۔ اس کا انجینیئر دماغ اب ایک ماہر شاطر کی صورت کام کر رہا تھا۔ جلدی ہی اس نے جان لیا تھا کہ کون سی گوٹی کہاں چلنی ہے۔ یہی بڑی وجہ رہی کہ نتائج بھی اسے اپنے موافق ہی ملتے جا رہے تھے۔ گوٹی کو ٹھیک مقام پر بٹھانے کے ضمن میں نثار کو سب سے زیادہ اپنے والد مولا بخش کا ہی خیال تھا۔ اس لیے سب سے پہلے تو اس نے اس کے بڑھ چلے خط کو استرا دکھانا بند کر دیا تھا۔ اس سے اس کی کھچڑی داڑھی دھیرے دھیرے بڑھتی ہی چلی گئی اور اس کا چہرہ نورانی ہوتا گیا۔ پھر نثار اسے اس طرح بھی رکھ رہا تھا کہ وہ زیادہ صحت مند بھی نظر نہ آنے لگے۔ کپڑے بھی اسے بس ٹھیک ٹھاک اور پرانے ہی پہننے کو دیے جاتے تھے۔ وجہ اس کی صاف تھی کہ اس طرف آتے جاتے لوگوں کو اس پر برابر ترس آتا رہے۔

تیز دماغ نثار نے اپنی ماں خاتون کو نہایت ہی صفائی کے ساتھ اس بات کا یقین دلا دیا تھا کہ وہ ایک پرائیویٹ سیکٹر کی کمپنی میں انجینیئر کی حیثیت سے ملازمت کرنے لگا ہے اور اسے تنخواہ کی شکل میں ہر ماہ ایک بڑی رقم مل رہی ہے۔ اس کے علاوہ اسے اس نے یہ بھی باور کرا ڈالا تھا کہ اس کے والد مولا بخش کا کہیں اتا پتہ نہیں ہے۔ تاہم اس کی تلاش مسلسل جاری ہے۔ اس طرح ادھر مولا بخش کو بھی وہ اس بات کا یقین دلا دینے میں کامیاب رہا کہ ایک زبردست حادثے میں اس کی والدہ خاتون کے دونوں ہی پیروں میں فریکچر ہو گئے ہیں اور ٹھیک ہونے میں اسے بہت زیادہ وقت لگے گا۔ وہ ذرا بھی چلنے پھرنے لگی تو ان دونوں کی ملاقات رہے گی۔

اس اثنا میں خاتون کے لیے نفیسہ کی فکر لازمی ہو گئی تھی۔ بہت پہلے ہی اس کے جوان جہان ہو جانے کے سبب یہ عین فطری بھی تھا۔ تب ڈھنگ کا ایک نوجوان دیکھ کر اس کے ہاتھ پیلے کر کے اچھے خاصے جہیز کے ساتھ اسے خوشی خوشی گھر سے رخصت کر دیا گیا۔ پھر اس کے بعد خاتون نے خود نثار سے بھی دولہا بن جانے کے لیے کہا تو اس نے اسے ٹال دیا اور آگے بھی وہ برابر اسے ٹالتا ہی گیا۔

ادھر خاتون کو ایک روز جب خاوند مولا بخش کے حقیقت اور بیٹے کی کارستانی کا پتہ چلا تو اسے ایک زبردست دھکا لگا۔ غصے میں وہ اس پر بری طرح سے بگڑ کر پھر بیٹھی۔ جلی کٹی سنانے کے بعد بلند آواز میں وہ اسے پھٹکارنے اور لتاڑنے بھی لگی۔ اس شرمناک حرکت کے لیے اس سے وہ ڈوب مرجانے کے لیے بھی کہہ بیٹھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اسی دم خاوند کو جلد از جلد گھر لے آنے کی تیاری بھی کر لی تاکہ عذاب ایسی زندگی سے وہ اسے نجات بھی دلا سکے۔ لیکن نیلی چھتری والے کو تو جیسے کچھ اور ہی منظور تھا۔

کہتے ہیں کہ بیٹے پر جی بھر کر برس کر دل کا غبار نکال ڈالنے کے دوران ہی خاتون کے خون کی رفتار میں اچانک ہی غیر معمولی اضافہ ہوا تو وہ چکرا کر کھڑی کھڑی وہیں گر پڑی اور کچھ ہی پل میں اللہ کو پیاری ہو گئی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عرصہء دراز کے بعد خاوند کا پتہ لگا تو اس کی بے پناہ خوشی کو وہ برداشت نہیں کر پائی اور اس کی حرکت قلب نے اچانک اور غیر متوقع طور پر جواب دے دیا تھا۔ دبی زبان میں کچھ کا تو یہ تک کہنا تھا کہ خود اس کے لخت جگر اور نور نظر نثار نے ہی اپنے ہاتھوں اسے جنت رسید کر ڈالا تھا۔ لیکن اچھی بھلی اور ہر طرح سے تندرست خاتون کے اس طرح اچانک ہی جہان فانی سے رخصت ہو رہنے کی اصل وجہ کا علم تو شاید اس کی اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک نثار کے علاوہ کسی ایک کو بھی نہیں تھا۔ ادھر جب مولا بخش کو بیوی کے نہ رہنے کا پتہ چلا تو آواز کے ساتھ وہ بے نور آنکھوں سے آنسو بہانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا۔

پھر ہوتے ہوتے کچھ ایسا ہوا کہ جس کے سبب نثار کو تعجب خیز مسرت ہوئی۔ شاہ راہ کے کنارے مولا بخش کے رہنے اور سونے کے مقام پر پہلے پہل دو تین لوگ بیٹھنے لگے اور پھر ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی خاص وجہ یہ رہی کہ مولا بخش بیمار اور پریشان حال لوگوں کی سن کر اپنے طور پر روحانی علاج کی صورت آیتیں پڑھ کر ان پر دم کرنے لگا تھا۔ اس کا خاصہ اثر بھی دیکھنے میں آ رہا تھا۔ بعد میں دبی زبان میں وہاں ایک جنے نے مولا بخش سے ایک روز مٹکے کا نمبر جان لینا چاہا تو اسے سخت کوفت ہوئی اور جھلا کر غصے کی حالت میں الل ٹپو میں ہی اس نے ایک کوئی نمبر تھوک ہی دیا تھا جیسے۔ اب یہ اتفاق رہا یا قدرت کا کرشمہ کہ شام ہونے سے پہلے پہلے اسی نمبر کے سبب نمبر پوچھنے والے کی جیبیں خاصی وزنی ہو چلی تھیں۔ پھر کیا تھا، سلسلہ چل نکلا۔ بعد میں مولا بخش سے دم کرانے والوں سے کئی گنا زیادہ تو وہاں مٹکے کے نمبر معلوم کرنے والوں کی آمد و رفت ہو گئی۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد میں دنوں دن اضافہ بھی ہوتا گیا۔ اسی کا نتیجہ یہ رہا کہ سڑک کے کنارے والے اس مقام کی اہمیت اور توقیر میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مولا بخش کے لیے وہاں ایک شاندار رہائش گاہ بھی بن کر تیار ہو گئی۔ بعد میں تو دور دور سے آنے والوں کے لیے وہاں لنگر بھی لگنے لگا تھا۔ اس طرح بھر پیٹ کھا کر سیر ہو جانے والے لوگ اس مقام کے معتقد بھی ہوتے گئے۔ انہی کی زبانی تشہیر کے سبب اس مقام کے معتقدوں کی تعداد سینکڑوں سے تجاوز کر کے ہزاروں میں بدل گئی اور وقت گزرنے کے ساتھ ہی ساتھ اس میں متواتر اضافہ بھی ہوتا گیا۔

ادھر نثار کے حالات بنیادی طور پر بدل چکے تھے۔ مولا بخش کے سبب خوشحالی کی بدلیاں متواتر اس پر برس رہی تھیں۔ دولت اس کی جانب جیسے دوڑی چلی آ رہی تھی۔ یہی وجہ رہی کہ زمین جائیداد اور لمبے چوڑے قیمتی پلاٹ خرید لینے کے علاوہ شیئر بازار میں بھی اس نے دور تک اپنا مستقبل محفوظ کر لیا تھا۔ بینک اکاؤنٹ اس کے اللہ کے فضل سے رشک کی حد تک بھرے بھرے تھے۔ بینک کے لاکروں میں قیمتی نگینے جڑے سونے چاندی کے زیورات اور ضروری کاغذات محفوظ تھے۔ قیمتی اور چمچماتی ہوئی کار میں اس کا آنا جانا ہو چلا تھا۔ آرام اور آسائشوں کے سبب چہرہ اس کا سرخ اور نورانی ہو چکا تھا۔

نثار کی زندگی میں لیکن کمی تھی تو مسکراتی ہوئی بہار کی شکل میں ایک عدد شریک حیات کی۔ اور اسی نسبت سے پھول ایسے ہنستے کھیلتے بچوں کی۔ تاہم اس پر یہ ایک بہت پرانی کہاوت صادق اتر رہی تھی کہ دودھ جب آسانی اور آرام سے مہیا ہوتا رہے تو گھر میں کسی دودھ دینے والے چوپائے کا کیا کام؟ اس کے ساتھ ہی کچھ لوگ بڑے وثوق سے یہ کہنے والے بھی تھے کہ نثار نشے کے اپنے پرانے شوق کو ڈھکے چھپے انداز میں اب بھی پالے ہوئے تھا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

(ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں)

ایک روز اچانک ہی مولا بخش پر یہ کلمات صادق آئے تو نہ صرف اس مقام پر بلکہ پورے علاقے میں ہی مات India چھا گیا۔ برق رفتاری کے ساتھ یہ خبر دور تک پھیلی تو سننے والے تمام لوگ ماتم میں ڈوب گئے۔ مولا بخش کے جسد خاکی کے آخری دیدار کر لینے کی غرض سے لوگ اس لیے بھی امڑے پڑ رہے تھے کہ جنازے کو میت گاڑی میں رکھ کر یہاں سے کئی کلومیٹر دور اس کے آبائی قبرستان میں لے جا کر تدفین کی بات تھی۔

نثار کو ادھر اپنے والد مرحوم کی برسوں پہلے ظاہر کر دی گئی آخری خواہش بھی خوب اچھی طرح سے یاد تھی۔۔۔ بیٹے میں جب نہ رہوں تو مجھے اپنے آبائی قبرستان میں میری والدہ کی قبر کے بغل میں ہی دفن کرنے کا انتظام کر دینا۔ اور خیال رہے کہ پکی قبر مت بنانا میری کہ اسلام میں اس کی اجازت ہی نہیں ہے۔ اپنے حضور کی بھی تو قبر کچی ہی ہے اور تا قیامت کچی ہی رہے گی۔ اور سن کہ ہمیشہ ہی لا الہ الا اللہ (نہیں ہے کوئی عبادت کے لائق سوائے اللہ کے) پر ہی عمل کرنا۔ اسی کی رو سے اس کے سوا کوئی بھی حاجت روا مشکل کشا اور غریب نواز نہیں ہے۔ اور جو کچھ بھی مانگنا ہے تو اسی سے مانگنا چاہیے۔ کسی بھی غیر اللہ سے مانگنا کفر ہے۔۔۔ لیکن انجینیئر نثار کا دماغ تو ادھر کچھ اور ہی پلاننگ کر چکا تھا۔ اپنی اس پلاننگ کو عملی جامہ پہنانے میں اس نے ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔ اسی کے مطابق لب سڑک ہی اس نے مولا بخش کو اس کے مقام کے پاس ہی دفن کر دیا گیا۔ تدفین کے بعد قبر پر جب بہت بڑے جم غفیر کی موجودگی میں پانی کا چھڑکاؤ کر دیا گیا تو اسی دم اسے ایک سبز چادر سے اچھی طرح سے ڈھک کر تازہ گلاب کے پھولوں کی ٹوکریاں الٹ دی گئیں۔ اگر بتیوں سے فضا کو مہکا ڈالنے کے ساتھ ہی دعا کا اہتمام ہو گیا۔ مولا بخش کی قبر پر دعا کرنے والے لا تعداد لوگوں کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھنے میں آ رہے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ مولا بخش کے اس مقام کو مقدس قرار دے کر وہاں اعلیٰ درجے کے سنگ مرمر سے اس کی قبر کو مزار کی شکل دے دی گئی اور یہاں کے بلند دروازے کے ٹھیک اوپر خوبصورت پٹی پر دور سے ہی پڑھنے میں آنے لگا۔۔۔ آستانہ نابینا سرکار۔۔۔ اس آستانے پر اب آٹھوں ہی پہر عقیدت مندوں کی آمد و رفت ہو گئی۔ ان عقیدت مندوں میں مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر ہر طبقے اور فرقے کے لوگ شامل تھے۔ امیر و غریب میں بھی یہاں کوئی تفریق نہیں تھی۔ مٹکے کے شائقین سے لے کر اعلیٰ درجے کے اور مخصوص لوگوں نیز شرفاء کا بھی یہاں آنا جانا ہو چلا تھا۔ ان میں سابق راج گھرانوں کے لوگ اور دور حاضرہ میں وقتاً فوقتاً اقتدار حاصل کر لینے والے سیاسی پارٹیوں کی با اثر شخصیتیں بھی شامل تھیں اعلیٰ افسران اور کئی سیٹھ ساہوکار بھی تھے ان میں۔ اسی ضمن میں یہ بھی کہ شیتل پرساد انڈسٹریز کی سیٹھ کو نثار نے ایک روز وہاں اہل خانہ سمیت سر جھکاتے دیکھا تو اسے بڑی تسلی اور تسکین میسر آئی۔ وجہ اس کی یہ رہی کہ اسی سیٹھ کی فیکٹری میں ڈیوٹی دینے کے دوران اس کے والد مرحوم نابینا سرکار مولا بخش نے اپنی آنکھوں کی روشنی کھو دی تھی اور پھر اس کے بعد اس کے عوض انجینیئر بیٹے نثار کو اس نے لاکھ منتوں کے بعد بھی اپنی فیکٹری میں رکھنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اور پھر بیٹھے بٹھائے نثار کو ایک روز خیال آیا۔۔۔ مال و دولت نیز ملکیت اس قدر ہو چلی ہے کہ سات پشتوں کا سامان ہی ہو گیا ہو جیسے۔ آگے بھی اس میں دن دونا رات چوگنا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ سات پشتیں تو دور کی بات رہی یہاں تو اگلی ایک پشت کا بھی پتہ نہیں ہے۔ تو؟ اور آنے والے وقت کی تصویر کا تصور کرتے ہوئے اپنے تئیں اس نے اسی دم ایک اہم فیصلہ لے لیا۔

اور برسوں بعد بھی اللہ کے فضل و کرم اور نابینا سرکار کے آستانے کے طفیل شہر کے معتبر رئیسوں میں شمار کر لیے گئے روحانی شخصیت محمد نثار صاحب اپنی فیملی کے ساتھ بنا کسی رخنے یا رکاوٹ کے آرام اور سکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو اس لیے کہ بالغ ہو چلی ان کی بڑی بیٹی اور اس سے چھوٹا بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کر لینے کی غرض سے مغرب کے ایک ترقی یافتہ ٹھنڈے ملک میں مقیم ہے۔ پرکشش اور قدرے فربہ ہو چلی نورانی چہرے والی ان کی اہلیہ قیمتی زیورات سے لدی پھندی ہمیشہ کی طرح اپنی شاندار رہائش گاہ میں شاد ہیں۔ نثار کا دایاں ہاتھ ہو چلا چھوٹا بیٹا ان دنوں اس کے ساتھ ہی نابینا سرکار کے سالانہ عرس کی تیاریوں میں رات دن ایک کیے ہوئے ہے۔

❑❑❑

غزل

یہ سانسیں آدمی کی مختصر ہیں
مگر ہر لمحہ یہ محوِ سفر ہیں

نشانی ہے خدا کی ان میں ظاہر
زمین پر جو بھی تحریر دہر ہیں

چلی ہوں ساتھ میں ان کے ہمیشہ
زمانے والے مجھ سے بے خبر ہیں

میں راہی ہوں چلتی جارہی ہوں
اجالوں کی طرف میری نظر ہیں

میرے ہمراہ نہیں چل پاؤگے تم
میرے ہمراہ تو برق و شرر ہیں

پڑھو ان کو رقم ہیں داستانیں
کہ یہ تیرے بزرگوں کے کھنڈر ہیں

سیاست میں قدم رکھنا نہ اپنا
کہ ان میں شاذیہؔ شعلے شرر ہیں

شاذیہؔ خان
لکشمن داس بلڈنگ، چوتھی لائن نشاط گنج لکھنؤ
8887984564

ڈاکٹر کہکشاں عرفان
نزد درگا پوجا گراؤنڈ، شاہ گنج، پریاگ راج
7054003555

افسانہ

پارٹ ٹائم شوہر

گھر کے تمام کاموں کو نپٹا کر ہائے توبہ کرتی تھکن سے چور، پسینے سے شرابور جسم، اور جسم سے چپکے لباس کو خشک کرنے اور راحت دینے کے لئے اپنے کمرے میں آ کر ثنا نے بجلی کے پنکھے کا بٹن دبایا اور پنکھے کے تینوں پنکھ آپس میں رقص کرنے لگے اور ثنا کے تھکے اور گیلے جسم کو فرحت بخشنے لگے۔ دھیرے دھیرے پسینے کی بوندیں خشک ہونے لگیں اور لباس بھی سوکھنے لگا۔ جسم کو تھوڑی سی راحت محسوس ہوئی تو ثنا کا ذہن اپنی تھکان اتارنے کے لئے گرما گرم چائے کی طلب کرنے لگا، حالانکہ دوپہر کا وقت تھا مگر ثنا کو ایک ہی نشہ کی لت لگی ہوئی تھی۔ وہ تھی چائے نوشی کوئی بھی وقت ہو یا کوئی بھی موسم، گرمی ہو یا پھر برسات ہر موسم میں چائے چاہیئے۔ وہ بھی بڑے سائز کے کپ میں۔ اس لئے ثنا نے دوبارہ باورچی خانے کا رخ کیا، ایک کپ گرما گرم الائچی والی چائے پکائی اور چائے کا کپ لے کر میں اپنے کمرے میں آئی تو دیکھا اسمارٹ فون ارتعاش پذیر تھا۔ گھر والوں کو بار بار فون کی گھنٹی یا نوٹیفکیشن کی آواز سنائی نہ دے لوگ اکثر و بیشتر موبائل فون سائلینٹ یا وائبریشن موڈ میں رکھتے ہیں۔ ثنا کا فون بھی زیادہ تر وائبریشن موڈ میں رہتا تا کہ اسے فون کالز اور میسیز کی آہٹ ملتی رہے۔ وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہوتی یا ذرا سی فرصت نکال کر فون چیک کرتی کہ واٹس اپ پر کتنے پیغامات ہیں؟ فیس بک پر کتنے نوٹیفکیشنز ہیں؟ کوئی میل آیا کہ نہیں؟ اسمارٹ فون بھی غضب کی چیز ہے جیسے علاء الدین کا چراغ جو چاہیے، گوگل سے مانگ لیجئے صاحب، یا پلے اسٹور سے ڈاؤن لوڈ کر لیجئے یا یوٹیوب میں تلاش کیجئے۔ اس دور میں اسمارٹ فون ہر مرض کی دوا ہے، بس شرط یہ ہے کہ انٹرنیٹ ہونا چاہیئے۔ اب تو بڑی سہولت ہے انٹرنیٹ کے لئے کسی سائبر کیفے کا چکر نہیں لگانا پڑتا ہے اپنی استطاعت اور سہولت کے مطابق نیٹ پیک چارج کریں اور گھر بیٹھے ہی دنیا جہاں کی معلومات یا تفریحات اور ضروریات بجلی کا بل ہو یا موبائل کا ری چارج، آن لائن خریداری ہو یا کسی کو رقم بھیجنی ہو ہر مشکل کا حل آپ کی مٹھی میں ہے۔ کسی انسان کو تلاش کرنا ہے فیس بک اکاؤنٹ بنائیں اور پھر ڈھونڈیں اپنے دوست احباب، ایک ڈھونڈو ہزار ملیں گے۔ اُف میں بھی کیا بتانے لگی۔ ہاں تو عرض ہے کہ ثنا اپنی سہولت کے مطابق اپنے فون پر آئے میسیجز اور ای میل اور نوٹیفکیشن کو دیکھتی، پڑھتی اور کالز کا جواب دیتی اور بہت سے میسیجز اور کالز ڈیٹیلز ڈیلیٹ کر دیا کرتی۔ جب سے ثنا نے کالمز لکھنے شروع کیے تھے ملک کے کئی شہروں سے حوصلہ افزائش اور داد و تحسین کے لئے کالز اور میل آنے لگی تھیں اور یہی تعریفیں ثنا کو جینے کا حوصلہ دیتیں اس کے دل کو خوشی سے معمور کر دیتیں۔ ثنا نے دیکھا ایک نئے نمبر سے کئی دفعہ کالز آئی ہوئی ہیں اور السلام علیکم لکھ کر سلامتی کا پیغام بھی بھیجا گیا ہے۔ ثنا نے بھی ایک مومن ہونے کا ثبوت پیش کیا جواب میں وعلیکم السلام لکھ بھیجا ساتھ ہی ایک سوال بھی۔

"آپ کون؟"

دوبارہ جب فون چیک کیا تو اس نامعلوم نمبر سے جواب حاضر تھا۔ "قمر" وہ من ہی من سوچنے لگی۔ "قمر" وہ کنفیوز تھی کہ یہ قمر کون ہے؟ ثنا نے ذہن پر زور دیا اور اپنے آپ سے سوال کیا کون ہوسکتا ہے؟ بچپن کا کلاس فیلو قمر الدین تو نہیں؟ مگر فوراً ہی اس خیال کو جھٹک دیا کیونکہ وہ بھلا مجھے کہاں یاد رکھے گا ماشاء اللہ ایک کامیاب اور مشہور ڈاکٹر ہے۔ اس کی ایک خوش باش فیملی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی والا قمر الحسن تو نہیں جس سے ورک شاپ میں ملاقات ہوئی تھی مگر بیس برس پہلے کی ملاقات کو آج کے پروفیشنل دور میں کون کسی کو بغیر مطلب کے یاد رکھتا ہے؟ یا اللہ کہیں شمسہ قمر تو نہیں؟ ثنا نے انگلیوں پر سن گنے۔ سترہ سال ہو گئے یونیورسٹی سے فارغ ہوئے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے لکھا۔ "کیا تم دہلی سے؟" اتفاق سے اس وقت وہ دونوں آن لائن تھے۔ فوری طور پر جواب آیا۔ "صحیح پہچانا میں دہلی سے" پھر ایک میسیج آیا" مجھے ڈر تھا کہیں تم مجھے بھول نہ گئی ہو' ثنا کو حیرانی ہوئی اس نے پوچھا "کیا میں تمہیں واقعی یاد تھی؟"

بہت دیر کے بعد جب ساؤنڈ بڑھا کر اسپیکر کو ٹچ کیا تو نسوانی آواز سن کر سب کے چہرے پھیکے پڑ گئے۔ ایک جملہ سارے گھر نے سنا وہ یہ تھا کہ۔۔۔"ایک ایسا شوہر چاہیئے جو چوبیس گھنٹے میرے سر پر مسلط نہ ہو"۔ تم سمجھ رہی ہو نہ؟ "مجھے۔۔۔۔۔۔۔ پارٹ ٹائم۔۔۔۔۔ شوہر چاہیے "ک ک ک کیا۔۔۔۔۔۔ کہا؟ ثنا نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ مجھے پارٹ ٹائم شوہر چاہیئے۔" جو زیادہ فارغ نہ ہو یار بیوی بچے ہوں تب بھی چلے گا۔ مجھے صرف شوہر کا نام اور تحفظ چاہیے جھوٹی اور ناپائیدار محبت نہیں۔" میں میں میں بعد میں ۔۔۔۔۔۔۔ بات کرتی ہوں" ثنا نے جلدی سے اسپیکر کو خاموش کر دیا کہ اللہ جانے قمر اب کیا بولے گی۔ ثنا نے جلدی سے" اللہ حافظ" کہہ کر فون کاٹ کر آف کر دیا کہ وہ دوبارہ کال نہ کر بیٹھے، اس نے اپنی شرط تو بتا دی مگر ثنا کو سوچوں کا لامتناہی سلسلہ دے گئی۔ ثنا نے کی زبان سے صرف اتنا نکلا" "اکیسویں صدی کی عورت ۔۔۔۔۔۔ اور پارٹ ٹائم شوہر۔۔۔۔۔۔"

قمر کا جواب آیا۔

" آف کورس، تم بھی کوئی بھولنے کی چیز ہو، ویسے بھی میری یاداشت بہت اچھی ہے، ایک بار کسی سے مل لوں تو کبھی نہیں بھولتی"

" میں تم سے باتیں کرنے کو بہت بے چین ہوں"

" کہاں کھوگئی ہو تم؟ میں نے تمہیں بہت تلاش کیا، پلیز اپنی آواز سنادو"

ثنا کا فری ٹائم تھا سب لوگ اپنے اپنے کام پر تھے بچے اسکول اور شوہر باہر، جیٹھ صاحب کچہری، جیٹھانی نیچے سلائی کر رہی تھیں اور گھر کی سربراہ یعنی بڑی نند صاحبہ بھی پڑوس میں اپنی چھوٹی بہن کے یہاں گئی ہوئی تھیں۔ موقع اچھا تھا اس نے سوچا قمر سے کچھ گپ شپ کی جائے اس نے کال ملائی۔ کال فوراً ریسیو کی گئی جیسے ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔ ثنا السلام علیکم کہتی اس سے پہلے ادھر سے قمر کا سلام آگیا۔ بہت چہکتی ہوئی پر مسرت آواز نے" السلام علیکم" کہا۔

ثنا نے بھی پر جوش انداز میں جواب دیا۔

" وعلیکم السلام" زہے نصیب"

اس کے ہنسنے کی آواز آئی اور اس نے کہا" تھینک گاڈ" دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی"۔

ثنا نے پوچھا" تمہیں میرا نمبر کس نے دیا میں تو کسی بھی دوست یا سہیلی کے رابطے میں نہیں"

تب قمر کی زندگی سے بھرپور آواز آئی" جہاں چاہ وہاں راہ"

" ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے"

" پھر بھی بتاؤ تو سہی کہ کس سے نمبر مانگا" ؟

" اس نے کہا تمہیں یاد ہے ہمارے گروپ میں شارق، طلحہ، اور ساجد بھی ہوا کرتے تھے"

" ہاں" " آج کل شارق کسی اخبار کا ایڈیٹر ہے" رقیہ کی شادی ہوگئی اور کچھ برسوں بعد طلاق بھی، ساجد نے پی ایچ ڈی مکمل کرلی اور کسی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر آف اردو ہے۔ طلحہ نے پی سی ایس کوالیفائی کرلیا تھا۔ اس وقت یوپی سیکریٹریٹ میں تعینات ہے اور شمائلہ شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ چلی گئی۔ سب سے کبھی نہ کبھی بات یا ملاقات ہو ہی جاتی ہے صرف تم ہی منظر عام سے غائب ہوگئیں تھیں۔

"اوہ۔۔۔۔۔۔ ثنا نے گہری سانس لی"

اچھا خیر یہ بتاؤ تمہیں میری یاد کیسے آئی؟

" کیوں؟"" یادوں پر پابندی ہے کیا" ہم تمہیں بھولے ہی کب تھے؟ تم نے ہی پلٹ کر ہماری خبر نہیں لی"

" نہیں تو میں نے یونہی کہہ دیا"

اس نے پھر سوال کیا:

" میں نے سنا ہے تمہاری شادی ہوگئی ہے"

" دو بچے بھی ہیں تمہارے"

" تمہارے شوہر کیا کرتے ہیں؟"

اس نے یکے بعد دیگرے کچھ سوال پوچھ جواب دونوں ہی دے ڈالے۔

ثنا بولی؟ صحیح سنا تم نے پی ایچ ڈی کی تھیسس جمع کرتے ہی گھر والوں نے واپس بلا لیا۔ میرے سارے خواب ادھورے رہ گئے نہ میں سول سروسز کی تیاری کر سکی، نہ وکالت کی تعلیم حاصل کر سکی اور نہ ہی اسسٹنٹ پروفیسر بننے کے لائق رہ گئی۔ گھر والوں نے دہلی سے واپس آنے کے چند ماہ بعد میری شادی طے کردی اور اس کے چار ماہ بعد میری شادی ہوگئی اور شادی کے دس ماہ بعد میرا پروموشن ہوگیا؟

" پروموشن؟"" کہیں ملازمت بھی کر رہی ہو؟" قمر نے استعجابیہ لہجے میں پوچھا۔

" ہاں پروموشن میں بیوی اور بہو سے ماں بن گئی" دوسرا بچہ بھی جلد ہی آگیا صرف ڈیڑھ سال کے فرق سے"

دوسری طرف سے ہنسنے کی آواز آئی اس نے کہا:

" کیا بات ہے یعنی ہم دو ہمارے دو" پروموشن پر پروموشن، بڑی کوئک سروس تھی"

" ہاں یار" میں نے کہا

پھر ایک سوال" تمہارے میاں جی کیا کرتے ہیں؟

" یہ مت پوچھو"

اب تم بتاؤ

" تم نے شادی کی؟ کہاں ہوئی؟ کتنے بچے ہیں؟"

ادھر سے ایک سرد آہ سنائی دی۔

" میں نے آج تک شادی ہی نہیں کی"

" ارے"

" تو تم نے شادی کا لڈو کھایا ہی نہیں" ؟

ثنا بولی" بہت اچھا کیا"

" تم مت للچاؤ کوئی چارم نہیں ہے"

" سماج جینے نہیں دیتا لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ گھر والے چہار طرفہ دباؤ ڈال رہے ہیں کیا کروں؟ سمجھ میں نہیں آتا، اسی لیے تم کو ڈھونڈا، تم کچھ مشورہ دو"

" میں کیا مشورہ دوں؟"

" کیا تم سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

" اگر میں تمہارے شہر آجاؤں تو؟ تو۔۔۔تو۔۔۔۔تب بھی ملاقات، بہت۔۔۔۔

" بہت مشکل ہے"

" کورونا اور لاک ڈاؤن کی وجہ سے؟"

" کیا کہا جائے ایسی کرونا وبا آئی سب کو لاک کر دیا"

نہیں نہیں نہ کرونا نہ لاک ڈاؤن کی وجہ سے میرے سسرال والے بہت کنزرویٹیو ہیں۔ میں تو شادی کے بعد سے مسلسل لاک ڈاؤن میں ہوں۔"

" جب سے میری شادی ہوئی ہے میں نے اپنے کسی دوست کو نہیں دیکھا کسی سہیلی سے نہیں ملی۔ مائکہ میں کسی کزن کی شادی میں شامل نہیں ہوئی۔ کسی اپنے عزیز کی میت میں نہیں گئی۔ کسی ادبی محفل میں بھی شامل نہیں ہوئی۔ گھر، بچے، شوہر، سسرال اور سسرالی عزیزوں تک محدود ہوں"

اب چونکنے کی باری قمر کی تھی۔" تم جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ، بولڈ اور ترقی پسند لڑکی اتنی پابندیاں کیسے برداشت کر رہی ہے؟ کیا بتاؤں۔۔۔؟ جب والدین غریب، بھائی بے حس ہوں تو لڑکیوں کو بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔

کیسے جی لیتی ہو؟ بس ایسے ہی، صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے، عمر یونہی تمام ہوتی ہے۔

پھر یہ مضامین، مقالے، تبصرے، کالمز کیسے لکھ لیتی ہو؟"

" یہ تحریریں میرے لئے آکسیجن کا کام کرتی ہیں، میرے جینے کا سامان ہیں۔ میری بے مول زندگی کا سرمایہ ہیں۔"" میرے اندر کی باشعور، حساس، تعلیم یافتہ اور ضدی قلم کار ہے جو مجھے مرنے نہیں دیتی۔ ورنہ۔۔۔۔۔۔۔اس شادی نے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

" اور یہ نیوز کیسے بنا لیتی ہو؟"" روز لوہے کے چنے چباتی ہوں"

" کتنی مشکل ہوتی ہے یہ بتا نہیں سکتی۔"" اچھا میرے پاس تمہارے لئے ایک آفر ہے"" کیسا آفر"" ایک اخبار کے مالک نے اخبار کی ایڈیٹنگ کے لئے گزارش کی ہے"" واقعی؟" کیا تم کر سکوگی؟

”مجھے ان کا نمبر اور میل آئی ڈی دے دو، سوچ سمجھ کے بتاؤں گی“ او کے اب فون رکھو آج بہت طویل گفتگو ہوگئی مجھے بہت بہت بہت ۔۔اچھا لگا تم سے باتیں کر کے، میری جٹھانیاں بے چین ہیں کہ میں کس سے اتنی بے تکلفی کے ساتھ اتنی طویل گفتگو کر رہی ہوں؟ اچھا اللہ حافظ““ فی امان اللہ“

ثنا نے بات ختم کی فون بند کیا اور سیڑھیوں سے نیچے اتر آئی۔ سبھی لوگ متجس تھے، مگر وہ بہت سرشار تھی۔آج برسوں بعد اس نے کسی دوست سے دل کھول کر باتیں کی تھیں۔اب تو میسیجز کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔صبح جب موبائل دیکھتی تو قمر کا گڈ مارننگ کا میسیج موجود ہوتا اور ساتھ میں اس اخبار کا پی ڈی ایف بھی جس کی ایڈیٹنگ کی قمر نے آفر کی تھی۔ثنا بھی صبح بخیر کا خوبصورت تصویر وتحریر والا میسیج جواب میں بھیج دیتی اور روزنامہ انقلاب کے بعد اس کا اخبار پڑھتی ۔اس نے دیکھا اخبار بے باک صحافت کا منھ بولتا ثبوت پیش کر رہا تھا، بہترین تحریریں، قارئین کو متوجہ کرنے والی سرخیاں، معیاری سیاسی وادبی مضامین، کئی روز ہو گئے ثنا نے سوچا کہ اخبار کے مدیر اعلیٰ سے بات کرے مگر اس کو گھریلو امور اور ذمہ داریوں سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔

تبھی ایک روز پھر قمر کی کال آگئی اور اتفاق سے اس وقت موبائل ثنا کے ہاتھ میں ہی تھا۔سلام کا لین دین ہوا، خیر خیریت پوچھی گئی اور پھر اس نے سوال کیا ”تم نے کیا سوچا؟“

ثنا نے کہا ”تم نے نہ نمبر دیا نہ میلنگ ایڈریس“ اس نے فوری طور پر نمبر اور میل آئی ڈی سینڈ کی اس نے بھی بہت بہت شکریہ لکھ بھیجا اور باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ثنا نے پوچھا ”تمہاری جاب کا کیا ہوا“ قمر نے جواب دیا۔

”مجھے ملازمت پسند نہیں میرا فری لانس کام ہے۔““ میں ہر طرح کی مارکیٹنگ میں ایکسپرٹ ہوں خواہ وہ کتابوں کی ہو یا اخبارات کی، کھانے کی اشیاء کی ہو یا پہننے کی۔“ بہت اچھا“ اچھا تو پھر شادی کا کیا ارادہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔“ اب سوچ لیا ہے میں بھی یہ لڈو کھا ہی لوں۔““ شاباش ثنا نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔“کوئی ہے نظر میں؟“ اس نے کہا۔“

بھائی بھابھی کی نظر میں ایک دو رشتے ہیں دیکھتے ہیں کس کے نام قرعہ فال نکلتا ہے۔““ ویسے کیسا رشتہ چاہیے تمہیں؟ میں کچھ مدد کروں؟

قمر نے جواب دیا“ میں آج کی عورت ہوں اکیسویں صدی کی عورت، میں بہت مختلف ہوں میری سوچ بھی بہت منفرد ہے۔بندھن پسند ہے مگر بے جا قید مجھے پسند نہیں، اسی لئے ملازمت کبھی نہیں کی شادی بھی فری لانس ٹائپ ہونی چاہیے۔“کیا مطلب ہے تمہارا“؟ اب چونکنے کی باری ثنا کی تھی۔اس نے تجسس سے پوچھا۔““ مجھے صرف یہ داغ مٹانا ہے کہ میں شادی کے لائق نہیں۔“ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے شادی کا شوق نہیں ہے۔اوور ایج ہوگئی ہوں۔“

سب کو خوبصورتی، پیسہ روپیہ دھن دولت، زمین جائیداد، بھاری بھر کم سونے کے زیورات کی خواہش ہوتی ہے کنوارے مرد کی خواہش ہوتی ہے۔مگر مجھے ایسا کچھ نہیں چاہیے، بلکہ میری پہلی شرط ہے کہ“ وہ شادی شدہ ہو نام نہاد کنوارا نہ ہو،““ اس کے بچے بھی ہوں تو چلے گا“ دوسری شرط مجھے مہر کے نام پر چند ہزار کیا لاکھ کی بھی رقم نہیں چاہئے بلکہ سر چھپانے اور زمانے کے سرد وگرم سے بچنے کے لئے چھوٹا سا آشیانہ چاہئے جسے میں اپنا گھر کہہ سکوں۔جہاں سے کوئی مجھے بے دخل نہ کر سکے اور نان نفقہ کے ساتھ ہر ماہ جیب خرچ چاہئے تاکہ چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لئے مجھے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔“

”قمر کی آواز میں کسی چوٹ کے درد کا احساس حاوی تھا۔“ ۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔۔کیا بتاؤں دراصل مجھے ۔۔۔۔۔۔کیسے بتاؤں؟ گھر والوں کا تجسس بھی عروج پر تھا سب الگ الگ بولیاں بول رہے تھے ان لوگوں کا شک عروج پر تھا ثنا کے شوہر بھی شک میں مبتلا ہو چکے تھے، قمر نام نے سب کو تجسس میں مبتلا کر رکھا تھا۔ثنا کے شوہر کی محبت اور بھروسے کی دیواروں میں دراڑ آنے لگی تھی ۔۔۔۔۔ ثنا بھی جان بوجھ کر کنارے چلی جاتی اور لوگوں کے شکوک کو ہوا دیتی اور کانا پھوسیوں سے محظوظ ہوتی رہتی ۔۔بہت دیر کے بعد جب ساؤنڈ بڑھا کر اسپیکر کو چُج کیا تو نسوانی آواز سن کر سب کے چہرے پھیکے پڑ گئے ۔ایک جملہ سارے گھر نے سنا وہ یہ تھا کہ۔۔۔۔“ایک ایسا شوہر چاہئے جو چوبیس گھنٹے میرے سر پر مسلط نہ ہو“۔تم سمجھ رہی ہو نہ؟ ” مجھے ۔۔۔۔۔۔۔ پارٹ ٹائم۔۔۔۔۔شوہر چاہیے“ ک ک کیا۔۔۔۔۔۔کہا؟ ثنا نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ مجھے پارٹ ٹائم شوہر چاہیئے۔“ جو زیادہ فارغ نہ ہو یا ربیوی بچے ہوں تب بھی چلے گا۔مجھے صرف شوہر کا نام اور تحفظ چاہیے جھوٹی اور ناپائیدار محبت نہیں۔

” میں میں میں بعد میں ۔۔۔۔۔۔۔ بات کرتی ہوں“ ثنا نے جلدی سے اسپیکر کو خاموش کر دیا کہ اللہ جانے قمر اب کیا بولے۔ثنا نے جلدی سے“ اللہ حافظ“ کہہ کر فون کاٹ کر آف کر دیا کہ وہ دوبارہ کال نہ کر بیٹھے، اس نے اپنی شرط تو بتادی مگر ثنا کو سوچوں کا لامتناہی سلسلہ دے گئی۔ثنا نے کی زبان سے صرف اتنا نکلا““ اکیسویں صدی کی عورت۔۔۔۔۔۔اور پارٹ ٹائم شوہر۔۔۔۔۔۔“

تبھی اس کی جٹھانی نے آواز دی۔

سنو ثنا تمہاری سہیلی بڑی آزاد اور بے باک لڑکی ہے۔کیسے دھڑلے سے اپنی شرائط اور پسند بتا رہی ہے۔اس سے دوستی ختم کر دو ورنہ تمہارا گھر تباہ ہو جائے گا اور اپنے میاں کا دل صاف کرو اس قمر نام کی بلا نے بہت گند پھیلا رکھی ہے اس کو جلد سے جلد صاف کرو کیسی سہیلی بنائی ہے تم نے؟۔

” کیوں؟ میں نے ایسا کیا کیا ہے؟ ثنا نے تنک کر پوچھا۔“ میں تو ان پر شک نہیں کرتی ان کی بھی فون کالز آتی ہیں ان کی بھی دوستی ہے وہ تو خوب نبھاتے ہیں۔ساری پابندیاں میرے لئے ہیں۔“ نند نے لقمہ دیا“ عورت تو شوہر کی شراکت برداشت نہیں کرتی وفا کی دیوی ہوتی ہے یہ کیسی عورت ہے؟ آگ لگے ایسی آزادی کو“ شوہر تو سر کا تاج ہوتا ہے۔سائبان ہوتا ہے۔یہ کیسی عورت ہے؟ شوہر سر پر مسلط نہ ہو کہہ رہی تھی۔دفعہ کرو اس لڑکی کو۔“ دوسری۔جٹھانی نے کہا یہ گھر بسانے والی لڑکی نہیں ہے۔ایسی لڑکی تمہاری سہیلی کیسے بن گئی؟ تم تو ایسی آزاد خیال نہیں؟ ثنا کے چہرے پر ایک تاثر آرہا تھا دوسرا جا رہا تھا، شرمندگی بھی تھی اور دل میں افسوس بھی۔مگر پھر بھی اپنی سہیلی کا دفاع کیا۔“ ایسا کچھ غلط نہیں کہا اس۔نے پہلے وہ۔۔۔بھی اتنی بولڈ نہیں تھی۔بے روزگاری، بے کاری، حق تلفی، عورتوں پر جبر، ٹوٹتی ہوئی شادیاں، گھریلو تشدد، بڑھتی ہوئی مہنگائی کے سامنے زندگیاں ختم ہو رہی ہیں۔پھر مہر کے نام پر چند ہزار روپیوں کی کیا بساط ہے؟ وہ بھی اکثر و بیشتر ادا نہیں کی جاتی۔اور بڑھتے ہوئے طلاق کے مسائل، میکہ میں بوجھ بن جانے کے خوف نے شاید عورت کی سوچ کو بدل دیا ہے۔شرعی حق تلفیوں نے گھر کی شرط رکھنے پر مجبور کیا ہوگا۔اور پارٹ ٹائم شوہر کے بارے میں کیا دلیل دوگی؟ ثنا دھیرے سے بولی“ میں دلیل دوگی تو آپ لوگوں کو اچھا نہیں لگے گا“ ہر لڑکی ثنا تو نہیں ہو سکتی۔سترہ سال گزر گئے مگر اپنی پسند کا کھانا اور ناشتہ پکانے کی اجازت نہیں، اکیلے کہیں جانے کی اجازت نہیں، پی ایچ ڈی کی ڈگری کے باوجود ملازمت کی اجازت نہیں، جیب خرچ تو دور کی بات ہے شوہر کی جیب کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں، کوئی سائل آجائے تو صدقہ، خیرات کی اجازت نہیں، ان کے موبائل کی کوئی کال ریسیو کرنے کی اجازت نہیں، بات کرتی ہیں آپ لوگ۔۔۔بس کیجئے ۔۔۔مجھے ڈرانا خدا کے واسطے۔“ جب ثنا نے زبان کھولی تو سب کے منھ پر تالے لگ گئے۔ثنا سیڑھیوں سے اتر کر اپنے کمرے میں آگئی اور سوچنے لگی کہ ثنا ناکام ہوگئی تو کوئی غم نہیں انسان چاند پر پہنچ گیا، مریخ پر کمندیں ڈال دی گئیں۔مگر عورت کے حقوق تسلیم کرنے اور دینے کو نہ حکام تیار ہے نہ عوام۔معاشرے کے جبر اور ظلم نے عورت سے وفا چھین لی۔

اکیسویں صدی کی عورت اتنی بولڈ اور باہمت ہوگئی۔۔۔۔۔؟ ثنا کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ ۔۔۔۔۔۔اور ہاتھوں میں کاغذ اور قلم۔آج اس کے افسانے کا عنوان تھا پارٹ ٹائم شوہر۔

❑❑❑

حسن بانو

شمشاد مارکیٹ، بمولا کالونی، علی گڑھ

9369524994

افسانہ

دادی کی زبانی

میری دادی مجھے بہت چاہتی تھیں کیونکہ میں اپنے چھوٹے بھائی رضوان سے بڑی تھی اور اُن کا کہنا بھی مانتی تھی، میرا نام اُنہوں نے پیار سے دُلاری رکھا تھا، جب بھی دُلاری پکارتی تھیں میں سمجھ جاتی تھی کہ کوئی کام دادی کو ہے، اور جب غصے میں ہوتی تھیں تو فوراً کہتی تھیں کہاں ہے یہ کلہاڑی؟ میں سہم جاتی تھی کہ اب شامت آگئی ہے کوئی کام مجھ سے غلط ہوگیا ہے، اب ڈانٹ یا مار کھانا پڑے گی، لیکن کیا وہ دن تھے آج بھی جب یاد آتے ہیں تو میں بیچین ہو جاتی ہوں۔ میرا چھوٹا بھائی رضوان بہت چنچل اور شیطان تھا، آئے دن محلہ سے شکایتیں آتی تھیں، اور دادی اُس کو پکڑ کر خوب جوتے لگاتی تھیں، جیسے جیسے وہ بڑا ہو رہا تھا ویسے ویسے اُس کی شیطانیوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مفتی گنج میں ایک اسکول تھا جو وکیل صاحب کا اسکول کہلاتا ہے، آج بھی وہاں کے بچے زیادہ تر ٹاپ آتے ہیں اور اب صرف وہ لڑکیوں کا اسکول رہ گیا ہے، پہلے اُس میں لڑکیاں اور لڑکے دونوں پڑھتے تھے، اُسی اسکول میں میرے والدین نے میرا اور رضوان کا ایڈمیشن کرا دیا تھا، انٹرول میں رضوان بہت شیطانی کرتا تھا اور آئے دن مار کھاتا تھا۔

ایک دن کی بات ہے کہ رضوان کی شکایت وکیل صاحب سے کر دی گئی، تب وکیل صاحب حیات تھے، انہوں نے رضوان کو پرنسپل روم میں بلایا اور اُس سے پوچھا کہ کیوں اتنی شیطانی کرتے ہو، اُس نے انکار کیا تو دوسرے بچوں کو بلایا گیا جنہوں نے رضوان کو شیطانی کرتے ہوئے دیکھا تھا، انہوں نے رضوان کے خلاف گواہی دے دی۔ اس پر وکیل صاحب خود رضوان کو اسکول کے کلاس روم کے پاس لائے اور زور زور سے چلائے کہ تم لوگ اپنے اپنے کلاس سے دیکھو کہ یہ کون ہے، یہ رضوان ہے درجہ چھ کا بچہ، اس کی روز شکایتیں ملتی ہیں، تم لوگ بھی دیکھ لو اس کا میں کیا حشر کرتا ہوں؟ یہ کہتے ہوئے انہوں نے رضوان کا ایک ہاتھ پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی سینڈل اتاری اور لے تیرے کی دے تیرے کی شروع ہو گئے۔ ہم لوگ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ انہوں نے رضوان کی سینڈل سے پٹائی کر کے یہ کہتے ہوئے چھوڑا کہ آج تو صرف سینڈل چلی ہے اور اگر آئندہ کوئی شکایت ملی تو تمہارا اس اسکول سے نام کاٹ دیا جائے گا۔ لیکن رضوان اتنا شیطان تھا کہ کہاں ماننے والا تھا ایک روز ایک نئے ماسٹر صاحب اردو پڑھانے آئے لیکن نہ جانے رضوان کو کیسے پتہ چل گیا کہ یہ ماسٹر صاحب ذرا اونچا سنتے ہیں۔ جب اُن کا پیریڈ آیا اور انہوں نے رضوان سے کہا کہ تم سبق پڑھو تو رضوان نے زور زور سے پڑھنا شروع کیا کہ ''بڑوں کا کہنا مانا کرو، روز صبح اٹھا کرو'' اس کے بعد دھیرے سے کہا کہ ماسٹر صاحب دیوانے ہیں، جس پر لڑکے زور زور سے ہنسنے لگے اور رضوان نے بغیر ہنسے ہوئے سبق کو آگے بڑھایا، ماسٹر صاحب دوسرے بچوں پر اتنا ناراض ہوئے کہ انہوں نے چھڑی اٹھائی اور سب کو ایک ساتھ مارنے لگے، اور رضوان کی تعریف کرتے کہ یہ بچہ کتنا اچھا ہے، پڑھائی بھی کر رہا ہے اور جبکہ دوسرے بچے ہنس رہے ہیں۔ یہ سلسلہ تین دن تک چلا جس پر ماسٹر صاحب کو بھی کچھ شک ہوا انہوں نے کلاس مانیٹر سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے، اُس نے سچ سچ ماسٹر صاحب کو بتا دیا، اگلے روز جیسے ہی رضوان سبق پڑھتے پڑھتے رُکا اور دھیرے سے کچھ ماسٹر صاحب کی شان میں کلمات ادا کیے، بچے جیسے ہی ہنسے ماسٹر صاحب نے کسی کو نہیں اُلٹا رضوان کو سوت دیا، اب رضوان بھی سمجھ گیا کہ اُس کی پول کھل چکی ہے۔

واقعی کیا بچپن تھا میرا، نہ کسی چیز کی فکر تھی نہ کسی کا غم، کسی کا شعر ہے کہ اُڑنے دو پرندوں کو ابھی شوخ ہوا میں، پھر لوٹ کے بچپن کے زمانے نہیں آتے' یا یہ کہ کتنے خوبصورت ہوا کرتے تھے بچپن کے وہ دن، صرف دو انگلیاں جڑنے سے دوستی پھر سے شروع ہو جایا کرتی تھی، کیا دن تھے وہ آج سوچتے ہیں کہ اُس وقت جب کلاس میں سے نکلنا ہوتا تھا تو دنیا کی ساری خوشیاں ایک طرف اور اسکول کی چھٹی ہونے سے پانچ منٹ پہلے اپنا بیگ ٹانگ کر بیٹھنے والی خوشیاں ایک طرف تھیں۔ کہنا یہی ہے کہ بہت خوبصورت تھا، محسوس ہی نہیں ہوا، کب کہاں اور کیسے چلا گیا بچپن میرا، جی چاہتا ہے کہ کہوں کاش اے زندگی تو میری بچپن کی گڑیا بن جا، تا کہ جب بھی میں جگاؤں تو جاگ جا۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ دادی جب تک مجھے سونے نہیں دیتی تھیں جب تک اُن کے رٹائے ہوئے سورے اُن کو نہ سنا دیتی، صبح صبح فجر کی نماز کے وقت اٹھا دیتی تھیں اور کہتی تھیں کہ چلو نماز پڑھو اور پھر قرآن شریف۔ رات کو سونے سے قبل اپنا سر دبواتی تھیں، اور سر

''اگلے روز ایک بہت بری خبر تھی وہ یہ کہ دادی میری کہیں جا رہی تھیں کہ راستہ بھول گئیں اور کہیں کی کہیں اور نکل گئیں جس پر دن بھر اُن کو ڈھونڈھا گیا لیکن وہ شام تک کہیں مل پائیں، اُس دن میں اسکول بھی نہیں گئی تھی، دن بھر میں روئی تھی، اور آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے، والدین اور رضوان بہت پریشان تھے، شام کو درگاہ کے پاس بیٹھی ہوئی ملیں، جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئیں خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا، میں اُن سے گلے لپٹ کر خوب روئی، رات میں جب میں اُن کے ساتھ لیٹی تو پھر انہوں نے بتانا شروع کیا کہ کس طرح وہ کہاں نکل گئی تھیں، آج انہوں نے کہانی کی تمہید نہیں باندھی تھی، نہیں تو کہانی سنانے سے قبل ہمیشہ کہتی تھیں کہ سنی سنائی کہانی سناتی ہوں، میں جب گنہگار ہوتی جب فرضی کہانی سناتی، اس لیے اللہ مجھے معاف فرمائے۔''

دباتے وقت ہی درس دیتی رہتی تھیں ، میرے بھی ذہن میں کئی طرح کے سوال آتے تھے جس کو میں اُن سے برابر پوچھا کرتی تھی۔ جیسے کہ ایک دن میں نے اُن سے پوچھا کہ دڈا آپ نے تو انگریزوں کو دیکھا ہوگا، کیا وہ لوگ ظلم کرتے تھے اور اگر ظلم کرتے تھے تو وہ ایسا کیوں کرتے تھے؟ جس پر دادی بڑے تفصیل سے بتایا کرتی تھیں کہ کس طرح سے ہندوستان کی جنگ آزادی کے لیے لوگوں نے کس طرح سے اپنی قربانیاں دیں اور کتنی جدوجہد کی۔ ہندوستان سے انگریزوں کے جانے سے قبل کی باتیں بھی بتاتی تھیں اور بعد کی بھی۔ جب بھی دڈا میرے سر دبانے سے خوش ہوتی تھیں ایک کہانی ضرور سناتی تھیں، ایک دن کی کہانی میں سکندر کی کہانی سنا رہی تھیں کہ ایک مرتبہ سکندر جنگل میں شکار کرتے ہوئے راستہ بھول گیا اور جب وہ بالکل تنہا رہ گیا اور اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا کہ سکندر کو ایک پیر مرد نظر آئے۔ ''تم کہاں جانا چاہتے ہو۔'' اس نے پوچھا؟ سکندر بہت عقلمند شخص تھا۔ اس نے فوراً پہچان لیا کہ یہ تو خواجہ خضر ہیں اس نے کہا ''مہربانی سے مجھے آبِ حیات تک پہنچا دیجئے میں جانا چاہتا ہوں تو خواجہ خضر نے انہیں چشمہ آبِ حیات تک پہنچا دیا۔ (یہ ایک ایسا چشمہ ہے جس کا پانی کوئی ذی حیات اگر پی لے تو اسے حیات ابدی مل جاتی ہے) اس چشمہ پر پہنچ کر سکندر نے بڑا دلدوز منظر دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ کافی لوگ ایسے ہیں جن کے نصف جسموں کو کیڑے کھا چکے ہیں۔ کچھ بہت ہی ضعیف و نحیف ہیں، کچھ کے دانت اعضاء تک جھڑ گئے ہیں صرف کھوپڑیاں باقی ہیں ان میں زیادہ تر موت کی دعائیں کر رہے ہیں مگر افسوس کہ ان کے لئے موت نہیں ہے۔ چنانچہ اس چشمے سے ایک قطرہ بھی پیئے بغیر سکندر واپس لوٹ آیا مگر اپنی بقیہ تمام زندگی وہ کف افسوس ملتا رہا کہ اس نے اس چشمہ کا پانی کیوں نہ پیا۔ دادی نے آگے مجھ سے بتایا کہ دُلاری جانتی ہو اُس کی موت جب ہوئی تو اُس نے کیا کارنامہ انجام دیا؟ میں نے کہا نہیں دڈا بتائیے کیا ہوا؟ آگے بتاتے ہوئے انہوں نے بیان کیا کہ:

''سکندر نے اس دنیا کو فتح کرنے کا خواب دیکھا تھا، آندھی طوفان کی طرح وہ اس دنیا کو نصف سے زیادہ فتح کر چکا تھا، لیکن ایک دن وہ بیمار پڑا اور اُس کی موت ہوگئی، اور مرنے سے قبل اُس نے ایک وصیت کی کہ اُس کا ہاتھ جنازے سے باہر نکال دیا جائے اور لوگوں کے پوچھنے پر بتایا جائے کہ سکندر چلا تھا اِس دنیا کو فتح کرنے لیکن آج وہ اس دنیا سے خالی ہاتھ جا رہا ہے۔ اس سے لوگوں کو عبرت حاصل ہوگی کہ اس دنیا سے ہر انسان کو خالی ہاتھ جانا ہے لیکن پھر بھی انسان لالچ میں پڑا رہتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ وہ خالی ہاتھ آیا ہے اور خالی ہاتھ جائے گا۔'' سنتے سنتے دڈا کی کہانی میں سو جاتی تھی اور پھر اگلے روز دوسری عبرت ناک کہانیوں کا آغاز ہوتا تھا اور میں سنتے سنتے سو جاتی تھی، کبھی تو پوری کہانی ہو جاتی تھی اور کبھی پوری کہانی نہیں سنا پاتی تھیں اس سے قبل میں سو جاتی تھی، اگلے روز پھر اُس کہانی کے بارے میں مجھے بتاتی تھیں کہ اس کا انجام یہ ہوا۔ اسی طرح ایک روز اپنی کہانی میں انہوں نے بتایا کہ آزادیِ وطن سے صرف چند سال قبل کی بات ہے کہ سپاٹ چہرے والا، اُلجھے اُلجھے بال، گہری لیکن تھکی ہوئی نگاہوں والا کھویا کھویا ایک افسردہ خاطر جوان تمہارے دادا کے باغ میں خاموشی سے داخل ہوگیا، جب کتوں کے بھونکنے کی آواز آنے لگی تب لوگوں نے جا کر دیکھا کہ یہ جوان خاموشی سے کھڑا ہوا ہے اور کتے اُسی پر بھونک رہے ہیں، لہٰذا اُس شخص کو تمہارے دادا کے سامنے پیش کیا گیا، پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ میں ایک شاعر ہوں، اور میرا نام آغا طاہر ہے اس باغ کو میں نے دیکھا اور یہاں کے سبزہ زار کو تو سوچا کہ اس باغ میں کہیں پر بیٹھ کر کچھ اشعار کہہ لوں گا لیکن ان کتوں نے میرے ذہن کو منتشر کر دیا اب میں کیا کروں؟ شعر تو کہنا دور اب کتوں کے بھونکنے کی آوازیں رات بھر میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔ بہرحال تمہارے دادا کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک شاعر ہے تو بہت خوش ہوئے اور اُن کو اپنا مہمان بنا لیا۔ خوب خاطر کی چونکہ تمہارے دادا بھی شاعر تھے اس لیے اُنہوں نے اپنے اشعار بھی اُس کو سنائے اور اُس کے بھی اشعار سنے۔ اس طرح سے دونوں میں دوستی ہوگئی۔ آغا طاہر سوز و گداز کا ایک جیتا جاگتا مرقع تھے، آغا طاہر لکھنؤ کے محلہ مصاحب گنج کے رہنے والے تھے، اُن کا کسی سے عشق چلا لیکن کامیابی نہ ملی جس سے کہ وہ ایک بڑے شاعر بن گئے۔ اُن کی شاعری اپنے محبوب کے لیے ہوتی تھی، اُن کو ان باتوں کا قطعی علم نہیں تھا کہ اُن کی غزلوں میں اتنا درد کیوں ہے اور اتنی کشش کیوں؟ ترنم میں جب وہ پڑھتے تھے تو ایک سماں بندھ جاتا تھا، اور ایک خاموشی سی طاری ہو جاتی تھی۔ اسی لیے تمہارے دادا اُن کے گرویدہ ہو گئے تھے۔

اسی اثنا میں ایک مشاعرہ کا اہتمام شیش محل میں کیا گیا تھا، جو ایک بہت بڑے نامی گرامی نواب صاحب کی جانب سے تھا، لوگوں کو معلوم تھا کہ اس مشاعرے میں کسی طرح کی کوئی کمی نہ ہوگی، شاعروں کو بڑے بڑے تحائف پیش کیے جائیں گے، اور مشاعرہ میں شرکت کرنے والوں کی دعوت بھی اچھی ہوگی لہٰذا اس مشاعرے میں بڑے مشہور و معروف شاعر بھی مدعو تھے۔ الغرض مشاعرہ شروع ہوا اور نواب صاحب نے گئو تکیہ لگا کر تمام شاعروں کو بڑے صبر سے سنا اور یہ بھی شعرائے کرام کو بتا دیا گیا تھا کہ آپ لوگ نواب صاحب کے مہمان ہیں اور یہ مشاعرہ تین دن تک چلے گا، اس لیے جلدی نہیں ہے سب لوگ اپنا کلام زیادہ سے زیادہ سنائیں۔ دو دن تک کے مشاعرے میں سبھی شاعروں کا کلام پڑھا جا چکا تھا، اب کوئی ایسا شاعر نہ بچا تھا جس کا کلام سنانے کے لیے باقی ہو۔ تیسرے دن سبھی شاعروں نے نواب صاحب سے جانے کی اجازت مانگی تو انہوں نے سبھی شاعروں کو بلایا اور کہا کہ بڑے شوق و ذوق سے میں نے آپ لوگوں کے سارے کلام سنے اب آپ لوگوں کا بھی فرض بنتا ہے کہ آج آخری دن ہے اس لیے میرا کلام آپ لوگ اطمینان سے سنیں تب مشاعرے کا اختتام ہوگا، اور اس کے بعد آپ لوگوں کو انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ اب کاٹو تو خون نہیں ایسی خاموشی چھائی کہ نواب صاحب بڑے خوش ہوئے کہ یہ لوگ اُن کا کلام سننے کے لیے آمادہ ہیں۔ اس کے بعد میری دادی نے اس مشاعرے کا حال جو بیان کیا وہ میں سن نہ سکی تھی کیونکہ مجھ پر غنودگی طاری ہوگئی تھی اور تھوڑی دیر بعد میں نیند کی آغوش میں سما چکی تھی۔

اگلے روز ایک بہت بری خبر تھی وہ یہ کہ دادی میری کہیں جا رہی تھیں کہ راستہ بھول گئیں اور کہیں کی کہیں اور نکل گئیں جس پر دن بھر اُن کو ڈھونڈھا گیا لیکن وہ شام تک کہیں مل پائیں، اُس دن میں اسکول بھی نہیں گئی تھی۔ دن بھر میں روئی تھی، اور آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے، والدین اور رضوان بہت پریشان تھے، شام کو درگاہ کے پاس بیٹھی ہوئی ملیں، جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئیں خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ میں اُن سے گلے لپٹ کر خوب روئی، رات میں جب میں اُن کے ساتھ لیٹی تو پھر انہوں نے بتانا شروع کیا کہ کس طرح وہ کہاں نکل گئی تھیں، آج انہوں نے کہانی کی تمہید نہیں باندھی تھی۔ نہیں تو کہانی سنانے سے قبل ہمیشہ کہتی تھیں کہ سنی سنائی کہانی سناتی ہوں، میں جب گنہگار ہوتی جب فرضی کہانی سناتی، اس لیے اللہ مجھے معاف فرمائے۔ اُس دن بھی یہی ہوا کہ نہ جانے کہاں سے کہاں کا واقعہ مجھے بتا رہی تھیں اور میں اونگھتے ہوئے سن رہی تھی، اور اسی اثنا میں نہ جانے کب میں سو گئی۔

اسی طرح دن گزرتے رہے اور ایک دن کی بات ہے کہ دادی کی طبیعت اچانک خراب ہوئی اور دن بہ دن اور زیادہ خراب ہوتی گئی اور ایک ہفتہ کے اندر ہی انہوں نے اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ دیا۔ والدہ نے مجھے بہت تسلی و تشفی دی لیکن ایک ہفتہ تک میری طبیعت بہت خراب رہی کیونکہ دڈا سے مجھے زیادہ رغبت تھی، اور میں انہیں کے ساتھ سوتی تھی۔ گھر مانو کاٹنے دوڑتا تھا، ادھر کچھ دنوں سے میری والدہ کی بھی طبیعت خراب رہنے لگی تھی، تعلیم بھی میری تقریباً مکمل ہو چکی تھی، کیونکہ میں نے شیعہ کالج سے گریجویٹ کر لیا تھا، اب والدین نے آگے پڑھنے کے لیے منع کر دیا تھا، اور مجھ سے صاف صاف کہہ دیا گیا تھا کہ اب تمہاری شادی ہوگی، کوئی تعلیم وغیرہ آگے جاری نہ ہوگی، لہٰذا میں بھی بے بس ہو کر گھر میں بیٹھ گئی تھی۔ ایک لڑکا ڈاکٹر (بی یو ایم ایس) میرے والدین کو میرے لیے مل گیا تھا اُسی سے میرا رشتہ کر دیا گیا۔ آج شادی کے بعد بھی میں اپنی دادی کے دیے ہوئے درس پر عمل پیرا ہوں، لیکن سماج میں جب نظر اٹھا کر دیکھتی ہوں تو آج کا ماحول ہی دوسرا ہے، ہر آدمی اتنا مصروف ہے کہ اُسے بات کرنے کی ذرا بھی فرصت نہیں ہے۔ جس کو دیکھو پیسہ کمانے میں مصروف ہے، انسان کی قدریں، انسان کی عزت و نفس کی کوئی قدر و قیمت کچھ نہیں رہ گئی بلکہ جو تمیز و تہذیب اور سیکھ و ادب میں نے اپنی دادی سے سیکھی تھی آج نہ جانے وہ کہاں گم ہوگئی۔

❑❑❑

رضوان عباس
مفتی گنج لکھنؤ
7084355868

افسانچہ

دل و دماغ کا وہم

یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں لکھنؤ میں ڈرائیونگ کرتا تھا یعنی کہ ٹیکسی چلاتا تھا، ہر طرح کی ٹیکسی جیسے ٹمپو، آٹو، کار جو بھی مل جائے۔ کبھی مجھے امپیڈ کر کار مل جاتی تھی تو کبھی کسی کا ڈرائیور بن کر چلا جاتا تھا، تعلیم تو میں نے بہت حاصل کرنا چاہی تھی لیکن قسمت میں ہائی اسکول ہی تک پڑھائی لکھی تھی، لہٰذا ہائی اسکول کر کے میں نے ڈرائیوری کی جاب کرنا شروع کر دیا تھا، میں اپنی تعلیم بھی جاری رکھنا چاہتا تھا اور ڈرائیونگ کا کام بھی ساتھ میں کرنا چاہتا تھا لیکن تعلیم میں کمی آگئی اور ڈرائیوری پروان چڑھ گئی، کیونکہ اچھی ڈرائیونگ کی وجہ سے مجھے لوگ بہت پسند کرتے تھے، اور کسی کو بھی کہیں باہر جانا ہوتا تھا مجھے فون کر کے بلا لیتے تھے، اور اس کے پیسے مجھے بہت اچھے ملتے تھے، ایک ٹور کا مجھے دو ہزار روپے تک مل جاتا تھا، حالانکہ میں ایک ٹور کر کے دو دن آرام کرتا تھا، اور دو دن کے بعد پھر دوسرے ٹور پر جاتا تھا، اسی طرح سے میرے گھر کی گاڑی چل رہی تھی۔ شادی کے پانچ سال یونہی گزر گئے اور کوئی سرکاری نوکری یا پرائیوٹ نوکری کی کبھی میں نے جستجو نہیں کی لہٰذا آج بھی میں اسی طرح ڈرائیوری کرتا ہوں، حالانکہ اب میں کم ہی فری رہتا ہوں کیونکہ زیادہ تر مجھے لوگ جان گئے ہیں۔

پانچ سال تک تو میری بیوی نے بھی مجھ پر ہر طرح سے دباؤ بنایا کہ کوئی اور بزنس کر و یا کہیں نوکری کرو لیکن مجھے تو اتنی خراب عادت پڑ چکی تھی کہ دو دن کسی کی گاڑی چلاؤں اور پھر کہیں سے کسی کی بکنگ آئے تب میں جاؤں، تو وہ بھی تھک ہار کر چپ ہو گئی، اور میری من مانی آج بھی ویسی ہی ہے۔ اسی اثنا میں تین بچوں کا باپ بن گیا۔ میرا سب سے بڑا بیٹا اکبر ہائی اسکول میں پہنچ گیا ہے اور میں نے اُس کی تعلیم میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، اب میں کہیں کی بھی بکنگ آتی ہے فوراً چلا جاتا ہوں، کیونکہ اکبر کی تعلیم کا جو مسئلہ ہے، اُس کو کچھ نہ کچھ چاہیے ہوتا ہے لہٰذا اب میں کافی محنت کرتا ہوں۔ کبھی کبھی تو کہیں سے تھک کر آتا ہوں اور اگر کہیں سے دوسری بکنگ آجاتی ہے تو پہلے کی طرح اب منع نہیں کرتا بلکہ اب فوراً چلا جاتا ہوں، جس سے کہ میرے حالات اب دھیرے دھیرے ٹھیک ہو رہے ہیں۔ ڈرائیوری کرتے ہوئے مجھے تقریباً ۲۰ سے ۲۵ برس ہو چکے ہیں اور میں اب اس میں اچھی طرح سے منجھ چکا ہوں، لیکن کچھ نہ کچھ ایسے میرے ساتھ حادثات پیش آتے ہیں جو مجھ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں جیسے کہ میں اپنی بیوی اور بڑے بھائی کے ساتھ فتح پور جا رہا تھا راستے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ حادثہ ہوتے ہوتے بچا، بڑے بھائی میرے آگے میرے بغل میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک نہ جانے کہاں سے ایک نیل گائے گاڑی کے سامنے سے بڑی تیزی سے گزر گئی اور مجھے پتہ تک نہ چلا، میرے بھیا بڑی زور سے چلائے اور کہا کہ آج تو گئے تھے بال بال بچ گئے، کیسے گاڑی چلاتے ہو، کافی غصہ وغیرہ کیا، لیکن مجھے تو عادت سی پڑ گئی ہے گاڑی چلانے کی یہ سب تو ہوتا رہتا ہے کہہ کر میں نے اُن کو چپ کرایا حالانکہ میری خود حالت خراب تھی اور سوچ رہا تھا کہ اگر دو یا تین سکنڈ کے بھی وقفہ کا فرق ہوا ہوتا تو آج گاڑی کے پرخچے اڑ جاتے اور ہم لوگ اسپتال میں ہوتے۔ بہر حال اسی طرح سے کئی حادثہ میری زندگی میں ہوئے لیکن ایک دن کی بات ہے کہ ایک حلوائی کی فیملی کو ہر دوئی چھوڑ کر آجانا تھا تب میں آٹو رکشا چلاتا تھا، حلوائی مجھ سے کہنے لگا ڈرائیور صاحب مجھے ہر دوئی چھوڑ دو، میں نے اُسے کم سے کم پیسے بتائے الغرض وہ تیار ہو گیا اور میں اُس کو ہر دوئی کے لیے لے کر روانہ ہو گیا۔ ہر دوئی سے پہلے ایک گاؤں پڑتا تھا وہیں جانا تھا، راستے میں اُس کے گاؤں کے موڑ پر جب میں پہنچا تو ایک باغ پڑا، وہیں پر میرا آٹو رکشا بند ہو گیا، کبھی ایسا ہوا نہیں تھا لہٰذا میں سوچنے لگا کہ آخر آٹو رکشہ بند کیوں ہوا؟ حلوائی مجھ سے کہنے لگا ڈرائیور صاحب جلدی یہاں سے چلو کیونکہ یہاں پر بھوت لگتے ہیں، یہاں سے جلدی نکل چلو، میں بہت ہنسا اور کہا کہ کوئی بھوت ووت نہیں ہوتا سب ایک وہم ہے آپ کا، گاڑی گرم ہو گئی ہے دس پندرہ منٹ ٹھنڈی کر لوں پھر چلتا ہوں، یہ کہہ کر میں نے آٹو رکشا کنارے کر کے کھڑا کر دیا، اور حلوائی سے ادھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو گیا۔ دن کے تین چار بج رہے تھے، دھوپ بھی تیز تھی لہٰذا مجھے یہی احساس ہوا کہ لکھنؤ سے سیدھے چلے آرہے ہیں، کاکوری پار کیا، ملیح آباد پار کیا اور اب اس حلوائی کا گاؤں آنے والا ہے لہٰذا گاڑی ہی گرم ہو گئی ہوگی، جب میں نے ۱۵ منٹ بعد گاڑی اسٹارٹ کی تو اسٹارٹ ہو گئی اور میں نے اُسے کسی طرح اُس کے گاؤں پہنچا دیا، وہ حلوائی بہت خوش ہوا اور اُس نے بہت اچھی لسی مجھے پلائی جس سے مجھے بڑی تازگی محسوس ہوئی اور ساری تھکان اُتر گئی۔

حساب کتاب کرنے کے بعد جب میں چلنے لگا تو حلوائی نے مجھے ٹوکا اور کہا کہ ڈرائیور صاحب شام ہو گئی ہے اور اندھیرا پھیلنے لگا ہے لہٰذا آپ یہیں رک جائیے گھر پر فون کر دیجئے اور صبح چلے جائیے گا کیونکہ جہاں پر آپ کا آٹو رکشہ بند ہوا تھا وہاں پر بھوت لگتے ہیں میں ہنسا اور وہاں سے اُس کی بات کو نظر انداز کر کے چل دیا۔ گاڑی لے کر تو میں چل دیا لیکن ایک وسوسہ دل میں میرے بیٹھ گیا جو حلوائی نے مجھے ڈرانے کی کوشش کی تھی، کہ کہیں سچ مچ تو اُس راستے میں بھوت وغیرہ تو نہیں ہے۔ دن تھا تو پتہ نہیں چلا اب تو رات ہو چکی تھی جب میں لوٹ رہا تھا۔ اتفاق سے جب میں اُس باغ کے قریب پہنچا تو مجھے سامنے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ایک جھومتا ہوا ہاتھی آتا ہوا دکھائی دیا، جس پر کوئی مہاوت بھی نہ تھا، مجھے فوراً یاد آیا کہ یہ تو وہی باغ ہے جہاں پر لکھنؤ سے آتے وقت میری گاڑی بند ہوئی تھی، اب میری حالت بہت خراب ہو گئی اور میں نے چاروں قل پڑھنا شروع کیا، آیۃ الکرسی بھی پڑھ ڈالی لیکن ہاتھی مستی سے جھومتا ہوا میری گاڑی کے قریب آتا رہا میں نے اپنی آٹو کو وہیں پر روک دیا اور جب میرے بالکل قریب آگیا تب میں گاڑی سے اتر کر کھیت کے مینڈ پر چڑھ گیا کہ اگر ہاتھی اپنی سونڈ سے میرا آٹو رکشہ پلٹ بھی دے تو میں اپنی جان بچا سکوں۔ ہاتھی میرے آٹو رکشہ کے قریب سے اپنی مستانی چال سے جھومتا ہوا گزر گیا اور میں دیکھتا رہ گیا اور یہ سوچا کہ آج میں بچ گیا، دل میرا بہت دھڑک رہا تھا، جب دل قابو میں آیا تو میں نے آٹو رکشا اسٹارٹ کیا اور دعائیں پڑھتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ تھوڑی دور چلا ہی تھا کہ میری گاڑی کی ہیڈ لائٹس ایک شخص پر پڑی جو کنارے پر بیٹھ کر شاید پیشاب کر رہا تھا، میں نے اُس کے قریب آٹو روکا اور کہا کہ تم ہی ہاتھی کے مالک ہو، اُس نے کھڑے ہوتے ہوتے کہا کہ ہاں صاحب، بہت سیدھا ہے کسی سے نہیں بولتا یہ کہتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔ میں نے اُسے دو چار باتیں سنائیں لیکن وہ سننے پر تیار نہ ہوا اور تیزی سے اپنے ہاتھی کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے اپنے اوپر بہت ہنسی بھی آئی اور فوراً یہ بات دماغ میں آئی کہ اگر کہیں مجھے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں یہ مہاوت نہ دکھائی دیتا تو میں جا کر اپنے دوستوں میں خوب ڈینگیں ہانکتا کہ آج میں بھوت والے باغ سے بچ کر آگیا، میں سب سے بتاتا کہ کس طرح سے میں نے چاروں قل اور آیۃ الکرسی پڑھ کر بھوت کو وہاں سے بھگایا، سوچتا جاتا تھا اور اکیلے ہی گاڑی چلاتے وقت خوب قہقہہ بھی لگا رہا تھا کہ یہ تو میرے دل و دماغ کا وہم تھا اُس باغ میں نہ تو کوئی بھوت تھا اور نہ کوئی پریت۔

❑❑❑

ہشام غزالی

عمر ہاؤس، مولوی گنج، امین آباد، لکھنو

7007906923

ترقیات

نئے ہندوستان کا نیا اور ترقی یافتہ اتر پردیش

وزیر اعظم کی قرار دادوں کے مطابق، ریاستی حکومت اتر پردیش کو ہندوستان کے ترقی کے انجن کے طور پر قائم کرنے کے عزم کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے، یہ ہے نئے ہندوستان کا نیا اور ترقی یافتہ ہندوستان، ترقی یافتہ اتر پردیش، ریاست نے گزشتہ 6-7 سالوں میں اپنی تصویر بدل دی ہے۔ وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ نے کہا ہے کہ ریاستی حکومت وزیر اعظم جناب نریندر مودی کی قرار دادوں کے مطابق اتر پردیش کو ہندوستان کے ترقی کے انجن کے طور پر قائم کرنے کے عزم کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ نئے ہندوستان کا نیا اور ترقی یافتہ اتر پردیش ہے۔ پچھلے 6-7 سالوں میں ریاست نے اپنی تصویر بدلی ہے۔ 07 سال پہلے اسے ملک کی ایک بیمار ریاست اور ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جاتا تھا۔ آج یہ بیمار ریاست کے زمرے سے نکل کر ملک میں لامحدود صلاحیتوں کی حامل ریاست کے طور پر خود کو قائم کر چکی ہے۔ ریاستی حکومت ریاست کی ترقی کے لیے مقرر کردہ اہداف کو مقررہ وقت میں حاصل کر رہی ہے۔

وزیر اعلیٰ نے براہ راست غیر ملکی سرمایہ کاری (ایف ڈی آئی) کانکلیو میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ریاست میں فطری ہنرمندی، فطری قابلیت اور باصلاحیت نوجوانوں کی تثلیث موجود ہے۔ اس کے ذریعے ریاست وزیر اعظم کی رہنمائی اور قیادت میں آگے بڑھ رہی ہے۔ گزشتہ 07 برسوں میں ریاست کی معیشت اور فی کس آمدنی کو دوگنا کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس کے پیچھے وزیر اعظم کا ایک وژن تھا، جسے مختلف شعبوں کے لیے پالیسیاں طے کر کے اور امن و امان کی بہتر صورتحال فراہم کر کے ایک مشن کی شکل میں مؤثر طریقے سے آگے بڑھایا گیا۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ ریاست کے بدلے ہوئے ماحول کے نتیجے میں اتر پردیش ملک کی دوسری سب سے بڑی معیشت بن گئی ہے۔ اسے ریونیو سرپلس ریاست کے طور پر قائم کیا گیا ہے۔ ریاست FDI اور فارچیون گلوبل 500 کمپنیوں کے لیے پالیسی لانے والی ملک کی پہلی ریاست بن گئی ہے۔ ریاست نے 2000 اور 2017 کے درمیان کل 17 برسوں میں 4 گنا FDI حاصل کی، 2019 اور 2023 کے درمیان صرف 4 برسوں میں۔ سرمایہ کار حکومت کے صاف ارادوں، واضح پالیسی اور محفوظ ماحول میں سرمایہ کاری کے لیے تیار ہیں۔ یہ ماحول آج ریاست میں نظر آرہا ہے۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اس وقت ریاست میں 14 فارچیون گلوبل 500 کمپنیاں کام کر رہی ہیں۔ ان میں سیم سنگ، مائیکروسافٹ، ایل جی، پیپسی کو، نیارا انرجی، ریلائنس انڈسٹریز، ٹاٹا، ہندوستان یونی لیور، ہائیر، آئیکی اے، اے آئی لیکوڈ اور ڈینسو وغیرہ شامل ہیں۔ یہ کمپنیاں کامیابی کے ساتھ اپنے کاروبار کو بڑھا رہی ہیں۔ یوپی گلوبل انویسٹرس سمٹ 2023 میں 400 بلین امریکی ڈالر کی سرمایہ کاری کی تجاویز موصول ہوئیں۔ ریاست سرمایہ کاری کے لیے ایک خواب کی

منزل کے طور پر ابھری ہے۔ سرمایہ کاروں کو درپیش چیلنجوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے، ریاستی حکومت کی جانب سے طے شدہ پالیسی کے تحت، زمین اور کیپٹل سبسڈی، اسٹامپ اور رجسٹریشن، بجلی ڈیوٹی میں رعایت فراہم کی جارہی ہے۔

وزیر اعلیٰ نے ریاست، ملک اور دنیا کے سرمایہ کاروں کو ریاست میں سرمایہ کاری کی دعوت دی اور یقین دلایا اور کہا کہ وہ ریاست میں محفوظ طریقے سے سرمایہ کاری کریں اور سہولیات سے فائدہ اٹھائیں۔ ریاست میں ان کی سرمایہ کاری مکمل طور پر محفوظ رہے گی اور کاروبار میں نئی خوشی فراہم کرے گی۔ ریاستی حکومت سرمایہ کاروں کے مفادات کو مکمل تحفظ فراہم کرنے کے لیے تیار ہے۔ انہوں نے کہا کہ ریاستی حکومت نے اس سمت میں ایک نئی کوشش شروع کی ہے۔ اس سے قبل سرمایہ کاروں کی فائلیں حکومت اور محکموں میں پھنسی رہیں۔ آج نویش مترا پورٹل سنگل ونڈو کی سہولت کے ساتھ سرمایہ کاروں کی سہولت کے لیے کام کر رہا ہے۔ نویش سارتھی پورٹل MOU کی نگرانی کے لیے سرمایہ کاروں کی خدمت کے لیے وقف ہے۔ ترغیبی نگرانی کا نظام ان سرمایہ کاروں کے لیے مؤثر طریقے سے کام کر رہا ہے جنہوں نے ریاست میں کامیابی سے سرمایہ کاری کی ہے۔ اسے ٹیکنالوجی کے ذریعے سرمایہ کاروں کے مسائل حل کرنے کے لیے تیار کیا جارہا ہے۔

❑❑❑

وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ ''انپورنا بھون'' اسکیم کے تحت خاتون کو مکان کی چابھی سونپتے ہوئے۔ساتھ میں نائب وزیراعلیٰ کیشو پرساد موریہ بھی موجود ہیں۔

وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ دیگر وزراء اور پولیس کے اعلیٰ افسران کے ساتھ 38 فائر بریگیڈ مراکز کے سنگ بنیاد تقریب کے موقع پر۔

वर्ष : 77 अंक 8
दिसम्बर, 2022
मूल्य : 15 रु./—
वार्षिक मूल्य : 180 रु./—

उर्दू मासिक, **नया दौर**
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ — 226 001

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006—08
ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. स्वत्वाधिकारी के लिए शिशिर, निदेशक, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. लखनऊ द्वारा प्रकाशित तथा प्रकाश एन. भार्गव, प्रकाश पैकेजर्स, प्रथम तल, शगुन पैलस, 3—सप्रू मार्ग, लखनऊ द्वारा मुद्रित, सम्पादक— **रेहान अब्बास**